مسلسل اشاعت کے 60 سال

رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ
فروری ۲۰۲۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- راہِ نجات از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- معیارات کا تضاد: باعثِ فساد
- اَلدِّیْنُ یُسْرٌ
- امتحان و آزمائش
- قرآن کے اصل مخاطب کون؟
- روزہ: برکات اور آفات
- نئی عالمی بساط اور اتّحادِ اُمّت کی ضرورت
- دی گریٹ گیم
- دورۂ ترجمۂ قرآن اور فریضۂ اقامتِ دین

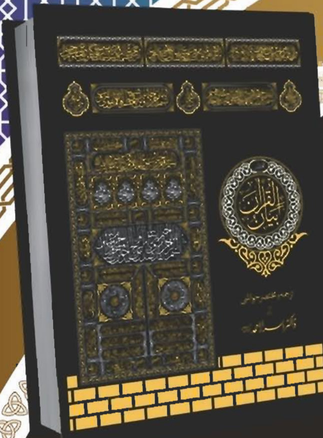

داعیِ رجوع الی القرآن، بانیِ تنظیمِ اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

- مضبوط جلد
- دیدہ زیب ٹائٹل
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1500 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 75
شمارہ : 2
رمضان المبارک : 1447ھ
فروری : 2026ء
فی شمارہ : 60 روپے
سالانہ زرِتعاون : 600 روپے
اس شمارے کی قیمت 120 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت
○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا
○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران
○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدام القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5
نئی عالمی بساط اور اتحادِ اُمت کی ضرورت — رضاء الحق

تذکرہ و تبصرہ 9
صومالی لینڈ اور عالمی طاقتوں کا ایجنڈا — شجاع الدین شیخ

ابوظبی سیریز 12
راہِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

درس قرآن 39
سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۵) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب 61
معیارات کا تضاد: باعثِ فساد — شجاع الدین شیخ

ظروف و احوال 71
دی گریٹ گیم — ایوب بیگ مرزا

تزکیہ نفس 81
روزہ: برکات اور آفات — مولانا امین احسن اصلاحیؒ

جلوۂ خورشید 96
منبع نور کی بازیافت — ریان بن نعمان

تزکیر و موعظت 103
امتحان و آزمائش — شیخ ابوکلیم مقصود الحسن الفیضی

دعوتِ فکر 119
قرآن کے اصل مخاطب کون؟ — حافظ محبوب احمد

افہام و تفہیم 135
منہجِ انقلابِ نبویؐ اور خدمتِ خلق — شجاع الدین شیخ

حقیقتِ دین 138
اَلدِّیْنُ یُسْرٌ — ڈاکٹر ربیعہ ابرار

حُسنِ معاشرت 151
ذمہ داری ادا کرنے کی اہمیت — حافظ محمد اسد

دعوت رجوع الی القرآن 156
دورۂ ترجمۂ قرآن اور فریضۂ اقامتِ دین — عبدالرؤف

آمدِ بہار 165
دورۂ ترجمۂ قرآن کا منظر اور پس منظر — مولانا شیخ رحیم الدین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نئی عالمی بساط اور اتحادِ اُمّت کی ضرورت

عالمی سیاست کو اگر محض خبروں‘ بیانات اور وقتی واقعات کے مجموعے کے طور پر دیکھا جائے تو بہت کچھ سمجھ سے باہر رہتا ہے۔ اگر اسے طاقت‘ مفادات اور منصوبہ بندی کی مسلسل کشمکش کے تناظر میں پرکھا جائے تو بظاہر منتشر واقعات ایک واضح تصویر میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

تاریخ کا ایک تلخ مگر ثابت شدہ اصول ہے کہ عالمی سیاست میں کچھ بھی محض اتفاقاً نہیں ہوتا‘ خصوصاً جب بات حساس جغرافیائی خطوں‘ آبی گزرگاہوں اور نظریاتی تصادم کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کا صومالی لینڈ کو تسلیم کرنا‘ یمن میں سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے درمیان کشیدگی کا شدت اختیار کرنا‘ ایران میں مہنگائی کے نام پر پُرتشدد احتجاج اور ہنگامے‘ غزہ میں جاری نسل کشی اور وینزویلا میں امریکہ کی کھلی جارحیت یہ سب الگ الگ کہانیاں نہیں بلکہ ایک ہی عالمی منظرنامے کے مختلف باب ہیں۔

صومالی لینڈ‘ جو بظاہر ایک غیر تسلیم شدہ ریاست ہے‘ درحقیقت عالمی طاقتوں کے لیے غیر معمولی کشش رکھتا ہے۔ بحیرۂ احمر‘ خلیج عدن اور باب المندب کے سنگم پر واقع یہ خطہ صرف جغرافیائی اہمیت ہی کا حامل نہیں بلکہ عالمی تجارت‘ توانائی کی ترسیل اور عسکری نگرانی کے اعتبار سے بھی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی بڑی بحری طاقتیں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ باب المندب پر گرفت کا مطلب نہرِ سویز تک رسائی اور عالمی تجارت کی شہ رگ پر ہاتھ رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صومالی لینڈ‘ جسے عالمی اداروں نے آج تک رسمی طور پر تسلیم نہیں کیا تھا‘ عملی طور پر ایک مکمل ریاستی ڈھانچے کے ساتھ موجود ہے اور بڑی طاقتوں کی نظریں اس پر مرکوز ہیں۔

اسرائیل کا صومالی لینڈ کو خاص اُسی وقت تسلیم کرنا جب بحیرۂ احمر میں کشیدگی بڑھ رہی ہو‘ محض سفارتی جرأت نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا strategic قدم ہے۔ اسرائیل اس اقدام کے ذریعے نہ صرف ایک نئے جغرافیائی محاذ پر قدم جما رہا ہے بلکہ ایران اور اُس کے اتحادیوں کی

بحری سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی صلاحیت بھی بڑھا رہا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ عرب دنیا کے اندرونی اختلافات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود کو ایک ناگزیر طاقت کے طور پر منوا رہا ہے۔ یہ وہی اسرائیل ہے جو عرب اتحاد کے وقت خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے اور عرب انتشار کے دور‘ میں غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کرتا ہے۔

یمن میں سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے درمیان بڑھتی ہوئی بداعتمادی اِسی انتشار کی ایک واضح مثال ہے۔ بظاہر دونوں ممالک ایک ہی اتحاد کا حصہ ہیں‘ مگر زمینی حقائق بتاتے ہیں کہ دونوں کے اہداف‘ ترجیحات اور حکمتِ عملی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جنوبی یمن‘ بندرگاہیں‘ جزائر اور ساحلی پٹی یہ سب اِس کشمکش کا مرکز بن چکے ہیں۔ حالیہ واقعات‘ الزامات‘ تردیدیں اور افواہیں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ محض عسکری تصادم نہیں بلکہ اثر و رسوخ کی جنگ ہے۔ ایسے ماحول میں ہمیشہ وہی قوت فائدہ اُٹھاتی ہے جو خود میدان میں اُترے بغیر دوسروں کو آپس میں اُلجھائے رکھے اور اِس کردار میں اسرائیل سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

یہ صورتِ حال ہمیں ایک بنیادی سوال کی طرف لے جاتی ہے: کیا یہ سب کچھ محض اتفاق ہے؟ یا ہم ایک منظم عالمی منصوبہ بندی کا مشاہدہ کر رہے ہیں جس میں مسلم دنیا کو مسلسل تقسیم اور کمزور رکھا جا رہا ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلم ممالک باہم دست و گریباں ہوتے ہیں تو‘ عالمی طاقتیں نہ صرف خاموش تماشائی نہیں بنتیں بلکہ اِس انتشار کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ اِس کی سب سے روشن مثال ہے‘ جو ہر نئے بحران میں پس منظر میں چلا جاتا ہے اور پھر کسی وقتی بیان یا قرارداد کے ذریعے وقتی تسلی دے دی جاتی ہے۔

اِسی عالمی تناظر میں امریکہ کی وینزویلا میں کھلی مداخلت کو دیکھا جانا چاہیے۔ وینزویلا کے صدر کو حالتِ امن میں گرفتار کر کے امریکہ منتقل کرنا بین الاقوامی قانون‘ ریاستی خودمختاری اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں‘ تاہم اس سے قبل جتنی بھی مثالیں ملتی ہیں وہ سب حالتِ جنگ سے متعلق ہیں۔

۲۰۰۴ء میں ہیٹی کے منتخب صدر جین برٹراند آرسٹائڈ ہنگاموں اور فوجی دباؤ کے بعد اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو امریکی فوجی طیارہ اُنہیں لے کر روانہ ہو گیا۔ اِس سے قبل ۲۰۰۳ء میں عراق کے صدر صدام حسین کو امریکی قیادت میں اتحادی افواج نے گرفتار

کیا۔ یہ ایک کثیر القومی جنگی آپریشن تھا‘ نہ کہ کسی پُرامن ملک کے سربراہ کی اچانک گرفتاری اور فوری امریکہ منتقلی۔ یہ ایک بالکل مختلف قانونی اور جنگی پس منظر رکھتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۸۹ء میں امریکی فوج نے پاناما کے آمر مینوئل نوریگا کو گرفتار کیا اور بعدازاں اُسے امریکہ لاکر مقدمہ چلایا گیا۔ یہ گرفتاری بھی ایک بڑی فوجی مداخلت کے تناظر میں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ طاقت جب قانون کو روندتی ہے تو عالمی ادارے محض رسمی احتجاج تک محدود رہ جاتے ہیں۔ تنظیم اقوام متحدہ جو دنیا بھر میں امن کی علامت سمجھی جاتی ہے‘ اکثر اوقات صرف اُن جنگوں کو روکنے میں سرگرم نظر آتی ہے جن سے طاقتور ممالک کو نقصان کا اندیشہ ہو‘ جبکہ کمزور اقوام کے تو زخم گننے تک ہی محدود رہتی ہے۔

یہی ’’جس کی لاٹھی‘ اس کی بھینس‘‘ کا اصول آج کی عالمی سیاست کا غیر تحریری مگر غالب قانون بن چکا ہے۔ طاقت اپنے داخلی قوانین کے تحت ہر قدم کو جائز قرار دے سکتی ہے‘ مگر بین الاقوامی قانون کی نظر میں یہ اقدامات ہمیشہ متنازع رہیں گے۔ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں دنیا نے کبھی طاقتور کو حقیقی معنوں میں جواب دہ نہیں ٹھہرایا‘ اور نہ ہی آج اس کی کوئی مثال دکھائی دیتی ہے۔

اِن تمام عالمی واقعات کے بیچ اصل سوال اُمّتِ مُسلمہ کا ہے۔ کیا ہم محض مظلوم ہونے کا بیانیہ دہراتے رہیں گے‘ یا اِس مظلومیت کے اسباب کا سنجیدہ جائزہ بھی لیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اُمّت کی کمزوری کا بنیادی سبب بیرونی سازشوں سے زیادہ ہماری داخلی تقسیم ہے۔ فرقہ واریت‘ قومیت‘ لسانیت اور ذاتی مفادات نے ہمیں اِس حد تک بانٹ دیا ہے کہ ہم اجتماعی ردِّعمل دینے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھے ہیں۔ غزہ‘ کشمیر‘ روہنگیا اور سوڈان یہ سب ہمارے اجتماعی ضمیر پر قرض ہیں‘ مگر ان قرضوں کو محض جذباتی نعروں سے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پاکستان‘ جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا‘ اس بحران سے الگ نہیں۔ قائداعظم نے واضح طور پر فرمایا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہوگا اور اس کے اصول قرآن وسُنّت سے ماخوذ ہوں گے۔ دستورِ ۱۹۷۳ء بھی اسی تصور کی عکاسی کرتا ہے۔ آئین کی دفعات حکومت کو پابند کرتی ہیں کہ قوانین کو قرآن وسُنّت کے مطابق بنایا جائے‘ مگر عملی طور پر نفاذِ دین ہمیشہ مؤخر کیا جاتا رہا۔ سودی نظام کے خاتمے کے لیے آئینی وعدے موجود ہیں‘ مدّتیں مقرر کی جا چکی ہیں‘ مگر

رکاوٹیں آج بھی وہیں کی وہیں ہیں۔ بعض قوانین پر فوری اور سختی سے عمل درآمد ہو جاتا ہے‘ مگر دین کی سربلندی کے معاملے میں اجتماعی بے حسی نمایاں ہے۔

عصرِ حاضر کی اس نئی عالمی بساط میں چھوٹے خطے بڑی طاقتوں کے مہرے بن چکے ہیں اور کمزور اقوام دوسروں کے فیصلوں کا ایندھن۔ اگر مسلم دنیا نے اِس حقیقت کو نہ سمجھا‘ اتحاد کو محض تقاریر اور قراردادوں تک محدود رکھا‘ تو تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کمزور نہیں ہوا بلکہ کمزوری ہمارے عمل میں ہے۔ اگر ہم خود انصاف‘ دیانت اور اجتماعی ذمہ داری کے تقاضے پورے نہیں کرتے تو عالمی سطح پر ہماری آواز کیوں کر مؤثر ہوگی؟ آج وقت ہے کہ ہم طاقت کی لاٹھی کے مقابلے میں اصول کی سیاست کو زندہ کریں‘ اور اتحادِ اُمّت کو محض خواب نہیں بلکہ عملی حقیقت بنائیں۔ دوسری صورت میں طاقت کی یہ لاٹھی ہمارے دروازے پر بھی دستک دے سکتی ہے اور اُس وقت شاید ہمارے پاس نہ احتجاج کی قوت ہو‘ نہ سوال کرنے کا حوصلہ۔

تاہم یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ عالمی سطح پر اسلام کو سمجھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اسلاموفوبیا میں کمی کی رپورٹس سامنے آ رہی ہیں‘ اور مخلص افراد مختلف پلیٹ فارمز پر اُمّت کو جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ترکیہ نے پاکستان اور سعودیہ کے عسکری اتحاد کا حصہ بننے کا عندیہ دیا ہے‘ جس سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی وہ خواہش پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ پاکستان ایران اور افغانستان کا اتحاد ہو جائے تو زمین پر اللہ کا نظام قائم کرنے کی صورت واضح ہو جائے گی۔ ترکیہ کے اِس اتحاد میں شامل ہونے سے اسلام دشمن طاقتوں کو تکلیف تو یقیناً پہنچے گی مگر زیادہ تکلیف تب پہنچے گی جب ایران اور افغانستان بھی اِس اتحاد میں شامل ہو کر دنیا کی رہنمائی کریں گے۔ ایسا ہو جائے تو یہ صدی واقعی دین کے غلبے کی صدی بن سکتی ہے‘ بشرطیکہ ہم جذباتی ردِّعمل کے بجائے شعوری اور منظم کردار ادا کریں۔

قارئین کرام نوٹ فرمالیں کہ ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ’’میثاق‘‘ کی یہ خصوصی اشاعت ماہ فروری اور مارچ (شعبان المعظم اور رمضان المبارک) کے دوشماروں پر محیط ہے۔ (ادارہ)

صومالی لینڈ اور عالمی طاقتوں کا ایجنڈا

شجاع الدین شیخ‘ امیر تنظیم اسلامی

گزشتہ چند روز میں بین الاقوامی منظرنامے میں جس تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں‘ اِس کے اثرات فوری بلکہ بہت دُور رس ہو سکتے ہیں۔ اسرائیل کا صومالی لینڈ کو آزاد ریاست تسلیم کر لینا‘ یمن میں سعودی عرب کی جانب سے متحدہ عرب امارات کے بحری جہاز پر حملہ‘ متحدہ عرب امارات کی افواج کا یمن سے نکلنے پر آمادہ ہو جانا‘ وینزویلا کے صدر کو امریکی فوجی کارروائی کے ذریعے امریکہ منتقل کر کے اُن پر مقدمہ چلانا‘ امریکہ کا ایران کے مظاہرین کی مدد کی آڑ میں جنگ مسلط کرنے کی دھمکیاں دینا اور دوسری جانب ترکیہ کا پاک سعودیہ دفاعی اتحاد میں شمولیت پر آمادہ ہو جانا۔ یہ سب واقعات بظاہر الگ الگ ہیں‘ مگر مجموعی طور پر یہ عالمی سیاست میں ایک بڑی گیم چینج کی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی تناظر میں پاک افغان مذاکرات میں ترکیہ کا ثالثی کے کردار سے دستبردار ہو جانا بھی ایک ایسا پہلو ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیسی اتحادِ ثلاثہ یعنی اسرائیل‘ امریکہ اور بھارت یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان اور افغانستان کے باہمی تعلقات کسی صورت بہتر نہ ہوں۔ دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف لفظی اور عملی محاذ آرائی میں اُلجھے رہیں تاکہ مستقبل کا وہ خراسان وجود میں نہ آسکے جہاں سے حضرت مہدیؒ کی نصرت کے لیے لشکر روانہ ہوں گے‘ اور پھر سیاہ جھنڈے لیے یہ افواج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر یہود کے خلاف آخری معرکے میں شریک ہوں گی۔ اسلامی روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نصرت سے اُس معرکے میں حق کو فتح نصیب ہوگی‘ دنیا سے ظلم کا خاتمہ ہوگا اور نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام عمل میں آئے گا‘ جس کی برکات سے پوری انسانیت مستفید ہوگی۔ ایسے میں وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ پاکستان اور

افغانستان جو برادر اور ہمسایہ مسلم ممالک ہیں‘ اپنے باہمی تعلقات کو دینی تعلیمات اور اسلامی اخوت کے اصولوں کے مطابق استوار کریں‘ تاکہ دشمن کے مذموم عزائم کو خاک میں ملایا جاسکے۔ تمام تصفیہ طلب معاملات کو مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے۔ صرف دہشت گردی اور فساد پھیلانے والے عناصر‘ نیز ان کے اندرونی و بیرونی سرپرستوں کے خلاف آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کارروائی کی جائے۔ جرم ثابت ہونے پر اُنہیں قرار واقعی سزا دی جائے‘ کیونکہ اسی طرزِ عمل میں ریاست اور اُمّت دونوں کا مفاد مضمر ہے۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ امریکی آشیرباد سے اسرائیل نہ صرف خطے بلکہ پوری دنیا کا تھانیدار بننے کا خواہاں ہے۔ اسی مقصد کے تحت وہ عالمی بساط پر مسلسل اپنے مہروں کو حرکت دے رہا ہے تاکہ گریٹر اسرائیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسرائیل کا صومالی لینڈ کو اچانک تسلیم کر لینا محض اتفاق نہیں۔ صومالی لینڈ بظاہر ایک غیر تسلیم شدہ ریاست ہے‘ مگر بحیرۂ احمر‘ خلیج عدن اور باب المندب پر اس کا محلِ وقوع اسے عالمی طاقتوں کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل بناتا ہے۔ یہ مشرقی افریقہ کے قرنِ افریقہ کے علاقے میں واقع ایک خطہ ہے جو بین الاقوامی سطح پر صومالیہ سے الگ ریاست تسلیم نہیں کیا گیا‘ تاہم مستقبل قریب میں اِسے تسلیم کیے جانے کے تسلسل کا اندیشہ موجود ہے۔ اسرائیل کے بعد امریکہ بھی اِسے تسلیم کرنے کے لیے مختلف جواز تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسرائیل کی جانب سے صومالی لینڈ کو خاص اسی وقت تسلیم کرنے کا راز دراصل اِس کے جغرافیائی محلِ وقوع میں پوشیدہ ہے‘ جس کی اسرائیل کو اس مرحلے پر شدید ضرورت ہے۔ یہ علاقہ باب المندب کے قریب اُس مقام پر واقع ہے جہاں بحیرۂ احمر اور خلیج عدن آپس میں ملتے ہیں۔ ایک طرف یمن اور جزیرہ نما عرب ہے جبکہ دوسری جانب جبوتی اور اریٹریا واقع ہیں۔ باب المندب نہ صرف بحیرۂ احمر کو بحرِ عرب اور بحرِ ہند سے جوڑتا ہے بلکہ نہرِ سویز تک جانے والے بحری راستے کا بھی لازمی حصہ ہے۔ یہاں سے ایران اور اس کے اتحادیوں کی بحری نقل و حرکت پر موثر نگرانی ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ علاقہ بحری‘ عسکری اور انٹیلی جنس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اسرائیل جو خود ایک متنازع اور ناجائز ریاست کے طور پر وجود میں آیا‘ ایک اور غیر تسلیم شدہ ریاست کو اس مقصد کے تحت تسلیم کر رہا ہے کہ نہ صرف گریٹر اسرائیل کے منصوبے کے تناظر میں خطے پر اپنا اثر و رسوخ

بڑھایا جا سکے بلکہ اہم عالمی آبی گزرگاہوں پر بھی کنٹرول حاصل کیا جا سکے۔ یوں اسرائیل اب صرف مشرقی بحیرۂ روم تک محدود نہیں رہا بلکہ بحیرۂ احمر میں بھی ایک فعال اور فیصلہ کن فریق بن چکا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق صومالیہ کے وزیر دفاع نے کہا ہے کہ اسرائیل فلسطینیوں کو جبراً صومالی لینڈ منتقل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ صومالی لینڈ کو تسلیم کرنے کے بعد اسرائیلی وزیر خارجہ نے پہلی مرتبہ اس علاقے کا دورہ بھی کیا اور باہمی تعلقات مضبوط بنانے‘ نیز اقتصادی‘ تکنیکی اور سکیورٹی تعاون بڑھانے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس دورے کے خلاف صومالیہ کے دارالحکومت مغدیشو میں سینکڑوں افراد نے احتجاج کیا اور اسرائیل کے فیصلے کو صومالیہ کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کی صریح خلاف ورزی قرار دیا۔ اسی طرح افریقی یونین نے بھی مطالبہ کیا کہ اسرائیل فوری طور پر صومالی لینڈ کو تسلیم کرنے کا فیصلہ واپس لے۔ یہ امر بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اسرائیل کی خارجہ پالیسی کا ایک مستقل اصول رہا ہے: جب عرب دنیا متحد ہوتی ہے تو اسرائیل دباؤ میں آ جاتا ہے‘ اور جب عرب ریاستیں باہم منتشر ہوں تو وہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس انتشار کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کوئی مشترکہ عرب محاذ تشکیل نہیں پا سکتا‘ فلسطین کا مسئلہ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور توجہ عرب دنیا کے داخلی تنازعات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

اسرائیل کا ایک خودمختار ریاست کے اٹوٹ حصے کو تسلیم کرنا محض سفارتی اقدام نہیں بلکہ ایک واضح سیاسی جارحیت ہے‘ جو ایک نہایت خطرناک نظیر قائم کر رہی ہے۔ اس اقدام سے افریقہ‘ بحیرۂ احمر کے خطے اور اس سے آگے عالمی امن وسلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اسرائیل کا یہ قدم صومالیہ کی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں پر براہِ راست حملے کے مترادف ہے۔ ایسے حالات میں بین الاقوامی برادری کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ یک زبان ہو کر صومالیہ کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے تمام اقدامات کو مسترد کرے۔ ✿✿

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

راہِ نجات

سورۃ العصر کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

ان اجتماعات میں مجھے آپ کے سامنے دو اہم باتیں رکھنی ہیں: (۱) دین کیا ہے‘ (۲) دین چاہتا کیا ہے؟ یعنی از روئے قرآن مجید یہ واضح ہو جائے کہ ہمارے دین کی طرف سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مَیں نے مطالعہ قرآن حکیم کا جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے‘ اُسی کا خلاصہ سامنے رکھا جائے گا‘ جس کا نقطہ آغاز سورۃ العصر ہے۔ آج مَیں اسی کے حوالے سے کچھ باتیں گوش گزار کر رہا ہوں تاکہ از روئے قرآن یہ واضح ہو جائے کہ راہِ نجات کا کیا تصور ہے!

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں مجھے یہ حسنِ ظن ہے کہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہو گی۔ گنتی کے چند الفاظ ہیں۔ پہلے میں اِس کا ایک سادہ سا ترجمہ کر دیتا ہوں‘ جس کو ہر شخص اپنے ذہن پر کندہ کر لے۔

﴿وَالْعَصْرِ ۝١﴾ ’’زمانے کی قسم ہے!‘‘ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢﴾ ’’بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں۔‘‘ گھاٹے میں ہیں‘ دھوکہ میں ہیں‘ نقصان میں ہیں‘ تباہی اور بربادی کا نوالہ بننے والے ہیں۔ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’سوائے اُن کے جو

ایمان لائے'' ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور انہوں نے نیک عمل کیے'' ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ ''اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی وصیت (اور تاکید) کی۔'' ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾ ''اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔''

اس سورۂ مبارکہ کا مَیں نے بارہا درس دیا ہے‘ اس کی متعدد ریکارڈنگز موجود ہیں۔ آج مجھے اس کو بیان کرنے میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے بہت سے حضرات نے وہ دُروس سنے ہوئے ہوں‘ ان کے لیے گویا کہ یہ ایک تکرار ہو جائے گی۔ اس پر میری ایک تحریر بھی مطبوعہ ہے‘ تو بہت سے حضرات کے سامنے وہ چیزیں بھی شاید ہوں۔ قرآن مجید کا معاملہ ایسا ہے کہ حضورﷺ کے الفاظ مبارکہ میں: ((لَا يَخْلَقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ)) (سنن الترمذی:۲۹۰۶) یعنی بار بار کی تکرار اور اعادہ سے اس پر کوئی باسی پن طاری نہیں ہوتا۔ یہ وہ کتاب نہیں ہے کہ جس کو چند مرتبہ پڑھنے کے بعد انسان محسوس کرے کہ اب کیا پڑھنا‘ پڑھ لیا‘ سمجھ لیا۔ یہ تو وہ کتاب ہے کہ ہر بار اس میں ایک نئی ندرت کا احساس ہوگا۔ اس کی رعنائی‘ اس کا حسن ہر بار ایک نئی شان کے ساتھ سامنے آئے گا۔ اس وقت حضورِ اقدسﷺ کا یہ فرمان مجھے نفسیاتی اعتبار سے ایک سہارا دے رہا ہے کہ چاہے مَیں نے اس سورۂ مبارکہ کو بارہا بیان کیا ہو لیکن آج اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرتے ہوئے پھر کوشش کر رہا ہوں کہ وہ مجھے صحیح اور دل نشین پیرائے میں اس سورۂ مبارکہ کے مفاہیم اور معنی و مراد کو پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ذہن کے دروازے بھی اس کے لیے کھول دے اور دل کے دروازے بھی کھول دے!

چار بنیادی باتیں

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چار بنیادی باتیں ذہن نشین کر لیں:

(۱) یہ قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس کی کُل تین آیات ہیں‘ جس سے کم پر قرآن مجید کی کوئی سورت مشتمل نہیں ہے۔ یاد رہے کہ ہم نماز کی رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ ملا کر جب قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھتے ہیں‘ اس کا نصاب بھی کم از کم تین آیات کا ہے۔ بڑی آیت ہو‘ جیسے آیۃ الکرسی‘ تو وہ ایک آیت بھی کفایت کر جائے گی۔ یہ

نبی اکرمﷺ کی ہدایات ہیں۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی تین ہی سورتیں ایسی ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں: سورۃ العصر‘ سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر۔

(۲) ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی اوّلین سورتوں میں سے ہے۔ قرآن مجید کی تنزیل بائیس برس میں مکمل ہوئی۔ قمری تقویم کے اعتبار سے یہ ۲۳ برس بنتے ہیں۔ ۶۱۰ عیسوی میں حضورﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور ۶۳۲ عیسوی میں آنحضورﷺ کا وصال ہوا۔ اس عرصے میں قرآن تھوڑا تھوڑا نازل ہوا۔ قرآن مجید کے نزول میں ایک ترتیب یہ بھی رہی کہ شروع میں بہت تھوڑا تھوڑا حصہ نازل ہوا اور اکثر قرآن مجید کے آخری پارہ کی چھوٹی سورتیں ہی سب سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی سورتیں وہ ہیں جنہوں نے ایک ہلچل مچا دی تھی۔ ان کے بارے میں ہی مولانا حالیؒ کا شعر ہے: ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

قرآن مجید میں جو سورتیں پہلے نازل ہوئیں وہ حجم کے اعتبار سے چھوٹی لیکن معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے ایسی ہیں جیسے دریا کوزے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اس کے بعد طویل مدنیات ان ہی سورتوں کی شرح ہیں۔ چنانچہ سورۃ ہود کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کا تعارف بایں الفاظ کرایا:

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱﴾

''الف لام را‘ یہ (قرآن مجید) وہ کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں (مضبوط کی گئیں‘ چھوٹے چھوٹے جملوں کے اندر معانی کے سمندر بند کیے گئے) پھر ایک حکیم اور خبیر ہستی کی طرف سے ان کی تفصیل بیان ہوئی۔''

یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے‘ اور سورۃ العصر بھی اوّلین سورتوں میں سے ایک ہے۔

(۳) ہر زبان کے ادب میں ''سہلِ ممتنع'' کی ایک اصطلاح آتی ہے‘ یعنی نہایت آسان زبان لیکن مضامین بہت بلند ہوں۔ بھاری بھرکم اصطلاحات میں اونچی باتیں بیان کرنا آسان ہے۔ اس کے برعکس مضامین بلند ہوں لیکن زبان سادہ ہو‘ یہ مشکل ہے۔ اس کو سہل

ممتنع کہتے ہیں کہ مضمون بظاہر تو بہت سہل نظر آئیں لیکن آپ ویسا کلام خود کہنا چاہیں تو دانتوں پسینہ آ جائے۔ جیسے مرزا غالب کا شعر ہے:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی!

اس غزل میں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے۔ اشعار سادہ‘ بالکل سلیس زبان میں ہیں لیکن اپنی ادبیت کے اعتبار سے یہ ایک معراج ہے۔ قرآن حکیم ویسے تو ابتدا سے انتہا تک عربی زبان کی ادبیت کی معراج ہے لیکن اس کے اعجاز کا سب سے نمایاں اور اولین پہلو یہی ہے جس پر اس نے چیلنج کیا ہے کہ اگر تم مقابلہ کر سکتے ہو تو کرو: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۳) ’’تو لے آؤ ایک ہی سورت اس جیسی۔‘‘ اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا‘ کوئی جھوٹ موٹ کو بھی میدان میں کھڑا نہ ہو سکا کہ میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں۔ پس قرآن مجید از ابتدا تا انتہا عربی ادب کا کلاسک ہے۔ البتہ اس میں بعض چوٹی کے مقامات ہیں‘ جیسے سورۃ الرحمٰن کے بارے میں حضور ﷺ کی حدیث ہے:

((لِكُلِّ شَيْءٍ عَرُوْسٌ وَعَرُوْسُ الْقُرْآنِ الرَّحْمٰنُ))

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

’’ہر چیز کا حسن و جمال ہوتا ہے جبکہ قرآن کا حسن و جمال سورۃ الرحمٰن ہے۔‘‘

اس میں ایک صوتی آہنگ ہے‘ اس کے اندر ایک غناء ہے‘ اس کے الفاظ کا ایک ظاہری حسن ہے۔ اسی طرح سہل ممتنع کے اعتبار سے قرآن مجید کی اہم ترین سورت ’’سورۃ العصر‘‘ ہے۔ اس میں کوئی مشکل لفظ نہیں آتا۔

﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ یہ لفظ عام اردو دان لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہم عصر اشخاص (contemporaries) جو ایک زمانے میں رہے‘ عصرِ حاضر‘ عصرِ رواں‘ عصرِ جدید۔ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ②﴾ انسان کا لفظ ہر کوئی جانتا ہے۔ خُسر یعنی خسارہ‘ یہ اردو کے اندر مستعمل ہے۔ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾ ایمان‘ عمل صالح عام الفاظ ہیں۔ تواصی ایک تھوڑی سی بدلی

ہوئی شکل ہے۔ اردو میں وصیت کا لفظ مستعمل ہے۔ وصیت سے تواصی بنا ہے‘ جو بابِ تفاعل سے آتا ہے۔ حق اور صبر بھی اردو کے عام الفاظ ہیں۔ پس کوئی بھاری بھرکم اصطلاح اس پوری سورت میں موجود نہیں۔ تاہم‘ اس سورت کے مفاہیم جو کسی درجہ میں سامنے آئیں گے تو جہاں تک علم اور حکمت کی معراج کا تعلق ہے‘ فلسفہ اور اس کے چوٹی کے مسائل اس سورت میں موجود ہیں۔

(۴) میرے نزدیک یہ قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ یہ اولین سورتوں میں سے ایک ہے‘ مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے اور یہ قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید هُدًى لِّلنَّاسِ ہے‘ نوعِ انسانی کے لیے ہدایت اور رہنمائی بن کر آیا ہے۔ اس ہدایت کے راستے کو‘ صراطِ مستقیم کو نہایت جامعیت کے ساتھ اس سورت میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں ایمان کے طویل مباحث ہیں۔ پھر اعمالِ صالحہ‘ عبادات‘ اخلاقیات اور معاملات کے مباحث آتے ہیں جو سب دراصل عمل صالح کی تشریحات ہیں۔ پھر جہاد‘ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مباحث ہیں جو تواصی بالحق کی شرح ہیں۔

قرآن مجید کے تمام مضامین کو جامع ترین صورت میں پیش کرنے والی سورت‘ سورۃ العصر ہے۔ اس کا احساس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اِس قدر تھا کہ ہمیں ایک روایت ملتی ہے:

كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَفْتَرِقَا حَتّٰى يَقْرَأَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ سُوْرَةَ الْعَصْرِ، ثُمَّ يُسَلِّمُ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ

(السلسلة الصحيحة للالبانی:۲۸۱۶)

’’نبی اکرم ﷺ کے صحابہؓ میں سے جب دو حضرات کی آپس میں ملاقات ہوتی تھی تو وہ اُس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ العصر نہ سنا لیتے۔ پھر وہ ایک دوسرے کو سلام کر کے علیحدہ ہوتے تھے۔‘‘

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں تھا۔ قرآن مجید کی اصل قدر و قیمت جاننے والے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں۔ یہ طرزِ عمل اس سورہ مبارکہ کے ساتھ ان کے خصوصی لگاؤ کا مظہر ہے۔

قرآن مجید کی سورتوں کی سردار سورۃ الاخلاص ہے‘ اس لیے کہ اسے حضور ﷺ نے ثُلث قرآن کے مساوی قرار دیا‘ یعنی یہ چار آیتیں ایک تہائی قرآن کے برابر ہیں۔ ایک تہائی قرآن کے مساوی ہونے کی وجہ کیا ہے؟ دراصل توحید اسلام کی جڑ‘ بنیاد ہے اور سورۃ الاخلاص میں توحید کا جامع ترین بیان ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ اہم ترین سورت ہے لیکن اس میں ایمان کے صرف ایک پہلو توحید کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اعمال کی کوئی بحث نہیں‘ تواصی بالحق کی کوئی بحث نہیں‘ تواصی بالصبر کی کوئی بحث نہیں۔ اس لحاظ سے اسے جامع ترین سورت نہیں کہیں گے‘ البتہ اہم ترین تو یقیناً ہے کیوں کہ ہمارے دین کی جڑ‘ بنیاد توحید ہی ہے۔ اسی طرح آیت الکرسی کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمام آیاتِ قرآنیہ کی سردار ہے۔ اس کی وجہ بھی توحید ہے‘ اس لیے کہ اسلام حقیقت میں دینِ توحید ہے‘ لیکن جامعیت ایک الگ شے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے مضامین کا احاطہ کر لینا سورۃ العصر کے علاوہ کسی اور سورت میں نظر نہیں آتا۔ دین کے فلسفہ کے لیے جڑ اور بنیاد سورۃ الفاتحہ ہے‘ جو قرآن مجید کا مقدمہ و دیباچہ ہے۔ اِسے اُمّ القرآن کہا گیا ہے اور اس کی سات آیات ہیں:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿٨٧﴾﴾ (الحجر)

لیکن جامعیت کے اعتبار سے جامع ترین سورت‘ سورۃ العصر ہے۔

بہرحال ایک تو صحابہ کرام ؓ کا عمل سامنے آ گیا۔ دوسرے امام شافعیؒ کے دو اقوال اس بارے میں ملتے ہیں۔ ایک قول تو ان کا بہت مشہور ہے:

لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ

’’اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر تدبر کریں (غور کریں‘ اس کی گہرائیوں میں اُتریں) تو یہ سورت ان کی ہدایت کے لیے کافی ہو جائے۔‘‘

امام شافعیؒ کا ایک اور قول مفتی محمد عبدہؒ نے اپنی تفسیر ’’المنار‘‘ میں نقل کیا ہے:

لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ

’’اگر قرآن مجید میں سوائے سورۃ العصر کے کوئی اور حصہ نازل نہ ہوتا تو یہ سورت

ہی لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی تھی۔‘‘

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک اس سورۂ مبارکہ کی کیا عظمت ہے!

فہمِ قرآن کے دو درجے

قرآن مجید کے فہم کا ایک درجہ ’’تذکر‘‘ ہے‘ جسے قرآن حکیم کی اصطلاح میں تذکّر بالقرآن کہتے ہیں۔ تذکر کے معنی ہیں نصیحت اخذ کر لینا‘ سبق حاصل کر لینا۔ بچپن میں جب ہم انگریزی کی کوئی سٹوری لکھتے تھے تو آخر میں Moral Lesson لکھتے یعنی اس کہانی کا سبق کیا ہے‘ اس سے حاصل کیا ہوا‘ اس کہانی کا لُبِ لُباب کیا ہے۔ اسی طرح ایک ہے قرآن مجید سے اس کے اصل سبق کو حاصل کر لینا جس کو قرآن حکیم تذکر‘ یاددہانی‘ نصیحت اخذ کرنا کہتا ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا یہ دعویٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۝﴾

’’اور ہم نے قرآن کو تذکر (نصیحت) کے لیے انتہائی آسان کر دیا ہے‘ پھر ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا!‘‘

یہ آیت سورۃ القمر میں چار مرتبہ آئی ہے۔ یہ اتنی صریح اور روشن یعنی کِتَابٌ مُّبِیْنٌ ہے کہ ایک شخص اس کو پڑھتا چلا جائے‘ چاہے وہ فلسفی نہ ہو‘ منطقی نہ ہو‘ اس نے کوئی اعلیٰ علوم حاصل نہ کیے ہوں لیکن اگر عربی زبان کے ساتھ اس کی تھوڑی سی واقفیت ہو تو وہ قرآن مجید کا اصل لُبِ لُباب حاصل کرتا چلا جائے گا۔ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔ انسانوں میں بدو بھی تھے‘ کاشت کار بھی ہیں‘ مزدور بھی ہیں‘ فلسفی بھی ہیں‘ حکماء بھی ہیں‘ اہلِ منطق بھی ہیں۔ قرآن مجید تو سب کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوا ہے‘ لہٰذا اس نے وہ انداز اختیار کیا کہ ایک عام بدو بھی اس کو سنے تو اسے محسوس ہو کہ یہ میرے دل کی پکار ہے۔ جیسا کہ مرزا غالب نے کہا: ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پس قرآن مجید کو تذکّر کے لیے آسان بنا دیا گیا ہے۔

قرآن مجید کو سمجھنے کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جسے قرآن نے ''تدبر'' قرار دیا ہے:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا ﴿۲۴﴾﴾ (محمد)

''توکیا وہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں!''

تدبّر کسے کہتے ہیں؟ قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور وفکر کرنا۔ گویا انسان اس میں غواصی کر رہا ہے' غوطہ لگا رہا ہے۔ علامہ اقبال کا ایک مشہور مصرعہ ہے: ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' حضورﷺ نے فرمایا: ((لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ)) ''اِس کے عجائبات کبھی ختم ہی نہیں ہوں گے۔'' بیسویں صدی کے فلسفی علامہ اقبال کو بھی مشرق و مغرب کے قدیم و جدید فلسفے کھنگالنے کے باوجود قرآن مجید کے دامن ہی میں تسکین حاصل ہوئی۔

گویا قرآن مجید کا ایک انداز تذکّر کا ہے اور ایک تدبر کا۔ تذکّر کے لیے یہ نہایت آسان جبکہ تدبر کے اعتبار سے انتہائی مشکل کتاب ہے۔ اس کی تہ تک پہنچنا انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے کلام کی تہ تک کوئی پہنچ پائے' یہ ناممکن ہے۔ یہ boundless ہے' اس کی کوئی حدود نہیں ہیں۔ یہ کلام مطلق ہے۔ کلام' متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔ اللہ کا کلام دراصل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات boundless ' مطلق' لامحدود' لامتناہی ہے اسی طرح قرآن مجید بھی لامحدود' لامتناہی ہے۔ اسی لیے حضورﷺ نے فرمایا کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اس پر غور کرنے والے غور کرتے رہیں گے' علم وحکمت کے موتی نکالتے چلے جائیں گے لیکن یہ کان ختم ہونے والی نہیں ہے۔ ہر دور میں علم وحکمت کے نئے موتی' نئے جواہرات اس سے نکالے جائیں گے۔

تدبر کے اعتبار سے یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے صرف سورۃ البقرہ پر آٹھ برس تک تدبر کیا۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ انہیں عربی سیکھنی نہیں تھی' صرف ونحو سیکھنی نہیں تھی' آیات کے شانِ نزول کے لیے کوئی کھوج کرید کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو خود اس ماحول میں تھے جس میں قرآن مجید نازل ہو رہا

تھا' سارا پس منظر ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ براہِ راست حضرت محمد رسول اللہﷺ سے سن رہے تھے۔ پھر کیا چیز تھی کہ صرف سورۃ البقرہ پر آٹھ برس تک تدبر کرتے رہے! سورۃ البقرہ قرآن مجید کے بارہویں حصے سے بھی کچھ کم بنتی ہے۔ اس حساب سے ایک صحابیٔ رسولﷺ کو قرآن مجید سمجھنے میں ایک سو برس لگ سکتے تھے۔ یہ معاملہ ہم تک پہنچے گا تو ہمیں شاید ہزار برس کی عمر چاہیے تب بھی قرآن مجید پر تدبر کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر تو نسل در نسل لوگ اپنی زندگیاں لگائیں گے۔

امام رازیؒ بھی یہ نہیں کہہ سکے کہ مَیں نے قرآن مجید پورا سمجھ لیا ہے۔ ۳۰ جلدوں میں تفسیر لکھنے والا شخص جو اپنے وقت کے فلسفہ اور علم کلام کی معراج پر پہنچا ہوا ہے' منطق جس کے گھر کی لونڈی ہے' جس کے لیے صرف ونحو ایسے ہے جیسے انسان اُن سے کھلونوں کی طرح سے کھیلتا ہو' مگر قرآن مجید کے بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ جہاں پر ایسا انسان بھی قلم رکھ دے' گھٹنے ٹیک دے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۳ ہے: ﴿ہُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاہِرُ وَالۡبَاطِنُ﴾ امام رازیؒ اس مقام پر آتے ہیں تو کہتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ مُھِیْبٌ عَمِیْقٌ ''جان لو کہ یہ مقام بہت عمیق اور گہرا ہے' بہت مشکل ہے' بڑا پُرہیبت ہے۔'' اس کی ترجمانی الفاظ میں کرنا ممکن نہیں۔ امام رازیؒ کا حال یہ ہو یعنی صاحبِ کشّاف یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ اس نے قرآن مجید کے ہر لفظ کو بیان کر دیا ہے تو مَیں' آپ یا اس بیسویں صدی کا کوئی بھی بڑے سے بڑا پڑھا لکھا شخص کیا دعویٰ کرے گا! لہٰذا جان لیجیے کہ فہمِ قرآن کے یہ دو درجے ہیں۔ ایک درجہ تذکّر ہے' اس کے اعتبار سے قرآن حکیم بہت آسان ہے۔ میں اس کی مثال یہ دیا کرتا ہوں کہ سمندر میں تیل کے ٹینکرز گزرتے ہیں۔ کبھی کوئی ٹینکر اگر leak کر جائے تو تیل پانی کی سطح پر رہتا ہے۔ اسی طرح سے قرآن مجید کی اصل حکمت' اصل سبق جو یہ سکھانا چاہتا ہے وہ قرآن کی سطح پر ہے۔ البتہ سمندر کی گہرائی کا اندازہ کیسے ہوگا! چنانچہ قرآن مجید کی گہرائی کو ناپنا ناممکن ہے۔ وہ ہے تذکّر بالقرآن اور یہ ہے تدبر بالقرآن۔

اب تذکّر کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کو سامنے رکھیے: ﴿وَالۡعَصۡرِ ۱﴾ ''زمانے کی قسم!'' جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کس چیز پر قسم کھائی گئی ہے' جملہ پورا نہیں ہوگا۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۲﴾ یہ ایک قاعدہ کلیہ بیان ہوا۔ آگے اس قاعدہ کلیہ سے ایک استثناء (exception) بیان فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۳﴾ جب تک مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ کے ساتھ نہیں جوڑیں گے' مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا۔ لہٰذا اصل میں یہ تینوں آیات مل کر ایک مکمل جملہ بنتی ہیں۔ ''زمانے کی قسم! تمام انسان برباد ہونے والے ہیں۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' اور جنہوں نے ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔'' اب اس جملے کو اپنے سامنے رکھیے۔ پہلا سبق کیا حاصل ہوتا ہے؟ پہلا تذکر کیا ہے؟

انسان کی کامیابی اور ناکامی کا ایک معیار ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ ہم جو بھاگ دوڑ اور صبح سے شام تک کی مشقت اس دنیا میں کر رہے ہیں' یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ کامیابی کے حصول کے لیے! البتہ کامیابی کے کچھ معیارات ہیں۔ ہمارے ذہن میں کامیابی کے جو معیارات بیٹھے ہوئے ہیں' وہ کیا ہیں؟ کامیابی پیسے سے ہے' کامیابی جائیداد سے ہے' کامیابی کاروبار سے ہے' کامیابی شہرت سے ہے' کامیابی اقتدار سے ہے۔ جو جتنا دولت مند' اتنا کامیاب۔ جو جتنا مشہور' اتنا کامیاب۔ جس نے بڑا کاروبار جما لیا' کامیاب۔ جس نے بہت جائیداد بنالی کامیاب! یہی ہے اصل میں ساری بِس کی گانٹھ (زہر کی پوٹلی' فساد کی جڑ)۔ جو تصور کامیابی کا ہوگا' اسی کے مطابق بھاگ دوڑ ہوگی' اسی کے لیے جِدّ وجُہد ہوگی' اسی کے لیے توانائیاں صَرف ہوں گی' اسی کے لیے دن رات کی مشقت ہوگی۔ یہ ہے اصل شے جس کی اس سورت میں نفی ہو رہی ہے کہ کامیابی دولت سے نہیں' شہرت سے نہیں' اقتدار سے نہیں' بلکہ کامیابی ہے ایمان سے' عملِ صالح سے' تواصی بالحق سے' تواصی بالصبر سے۔ اس نقطہ نظر کا' اس طرزِ عمل کا' اس mental

attitude کا بدل جانا ہی انسانی شخصیت کے اندر انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر تو دولت سے کامیابی ہوتی تو قارون بہت کامیاب تھا۔ اگر حکومت سے کامیابی ہوتی تو فرعون اور نمرود بہت کامیاب تھے۔ دراصل کامیابی ان چیزوں سے ہے ہی نہیں۔ کوئی انسان دولت میں قارون کی دولت تک پہنچ جائے اور دنیا میں دبدبہ اور اقتدار کے اعتبار سے وہ نمرود اور فرعون کا مقام حاصل کر لے' پھر بھی وہ ناکام ہے' خائب ہے' خاسر ہے' برباد ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابوذر غفاری ؓ کامیاب ہیں چاہے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ جھونپڑی تک نہیں تھی' کوئی گھر نہیں تھا۔ صحیح مسلم کی روایت ہے' حضور ﷺ کے فرمان کا مفہوم ہے:

''اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو کسی محفل میں جانا چاہیں تو انہیں اجازت نہ ملے۔ اگر کہیں رشتہ کرنا چاہیں تو کوئی ان سے رشتہ کرنے کو تیار نہ ہو۔ کہیں کوئی سفارش کرنا چاہیں تو ان کی کوئی بات ہی نہ سنے' لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا وہ مقام ہے کہ اگر بھولے سے بھی کسی بات پر قسم کھا بیٹھتے ہیں تو اللہ ان کی قسم کی لاج رکھتا ہے۔''

یہ فرق اچھی طرح جان لیجیے۔ اس بات کا مان لینا آسان' اس پر سبحان اللہ کہہ دینا سہل' لیکن اس کے مطابق ذہن کا بدل جانا بہت مشکل ہے' اس لیے کہ ہم اپنے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ بڑا محل ہے جس کو دیکھ کر ایک دفعہ آدمی کو جھرجھری آتی ہے۔ بیس فٹ لمبی کار زناٹے کے ساتھ آپ کے پاس سے گزر گئی تو ایک دفعہ اعصاب کے اندر ارتعاش ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بڑے نصیبوں والے لوگ ہیں' بڑے کامیاب' حالانکہ کچھ معلوم نہیں کہ یہی سب سے بڑی بدنصیبی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہی سب سے بڑی ناکامی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فوز وفلاح سے ہم کنار ہونے والوں کی صفات بیان کرتے ہوئے بارہا کہا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝﴾ ''یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔''

ہمارے لیے سب سے بڑا سبق یہ جاننے میں ہے کہ کامیابی کس چیز سے ہے۔ اگر ہمارے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے' ہمارے دل میں جاگزیں ہو جائے تو زندگی

بدل جائے گی ۔صبح وشام کے نقشے بدل جائیں گے‘ بھاگ دوڑ کا رنگ بدل جائے گا‘ value structure بدل جائے گا۔آج ایک چیز نہایت اہم نظر آرہی ہے لیکن کل بہت غیر اہم نظر آئے گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَالِيْ وَمَا لِلدُّنْيَا، مَا اَنَا فِي الدُّنْيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا)) (سنن الترمذی:۲۳۷۷)

’’مجھے تمہاری اس دُنیا سے کیا سروکار؟ میری اور دنیا کی مثال تو اس سوار کی سی ہے جو (تھوڑی دیر ستانے کے لیے) ایک درخت کے سائے میں ٹھہرتا ہے‘ پھر وہ اپنا راستہ لے لیتا ہے۔‘‘

اس درخت سے اُس کا مستقل تعلق نہیں ہے۔ وہ اس کا گھر نہیں ہے‘ اس کی منزل نہیں ہے۔ اسی طرح یہ دنیا میرا گھر نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں:﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۱۵۶﴾ (البقرۃ) ’’یقیناً ہم اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔‘‘ یعنی ہم تو مسافر ہیں۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) (صحیح البخاری:۶۴۱۶)

’’دنیا میں ایسے رہو جیسے تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر۔‘‘

البتہ یہ طرزِ عمل اس وقت ہوگا جب یہ آیت ہمارے ذہن کے اندر بیٹھ گئی ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کو سورۃ العصر کیوں یاد دلاتے تھے؟ اس لیے کہ جیسے برف باری میں باہر نکلیں تو برف کپڑوں پر جم جاتی ہے‘ پھر کپڑوں کو جھٹکتے ہیں تاکہ برف ہٹ جائے‘ اسی طرح اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے ایمان پر ماحول کا گہرا اثر آجاتا ہے‘ گرد پڑ جاتی ہے‘ برف پڑ جاتی ہے۔اس کو بار بار جھٹکتے رہنے کی ضرورت ہے‘ جس کی بہترین اور مؤثر ترین شکل یہ بات مستحضر رکھنے میں ہے کہ کامیابی ان چیزوں سے نہیں ہے۔ دنیا کی یہ ساری چمک دمک جو ہمیں رِجھا رہی ہے‘ اپنے اندر گم کیے ہوئے ہے‘ اس لفظ گم پر علامہ اقبال کا شعر یاد آ گیا: ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

تو اس میں گم نہ ہو کر رہ جاؤ‘ مبہوت نہ ہو کر رہ جاؤ‘ مرعوب نہ ہو کر رہ جاؤ۔ دنیا کی محبت تمہارے اوپر ڈیرے نہ ڈال لے‘ تمہارے دل کے اوپر مسلط نہ ہو جائے۔ لہٰذا پھر یاد کر لو‘ پھر تازہ کر لو اپنے اس یقین کو کہ کامیابی دولت سے نہیں‘ اقتدار سے نہیں‘ شہرت سے نہیں۔ کامیابی ہے ایمان سے‘ عمل صالح سے‘ تواصی بالحق سے‘ تواصی بالصبر سے۔ پہلی بات یہ سمجھ میں آئی کہ چار چیزیں کامیابی کے لوازم ہیں۔

نجات کے لازمی تقاضے

دوسری بات یہ کہ یہاں پر کامیابی کا اعلیٰ معیار بیان نہیں کیا جا رہا بلکہ اس کا کم سے کم معیار بتایا جا رہا ہے۔ سورۃ العصر کا سورۃ التین سے تقابل کیجیے۔ سورۃ العصر بتا رہی ہے کہ سب لوگ خسارے میں ہیں‘ سوائے ان کے جو یہ چار شرائط پوری کریں۔ سورۃ التین میں صرف دو شرطیں بیان ہوئی ہیں‘ دو بیان نہیں ہوئیں۔ گویا کام ہلکا اور آسان ہو گیا۔

سورۃ التین میں فرمایا گیا:﴿ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۶﴾ کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا‘ جبکہ سورۃ العصر میں کہا جا رہا ہے کہ وہ ناکامی سے بچ جائیں گے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی طالب علم کو کہا جائے کہ محنت کرو گے تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاؤ گے اور کسی سے یہ کہیں کہ محنت کرو‘ ورنہ فیل ہو جاؤ گے۔ ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہی فرق سورۃ التین اور سورۃ العصر میں ہے۔ سورۃ العصر ناکامی سے استثناء کو بیان کر رہی ہے جس میں چار شرطیں ہیں جبکہ سورۃ التین میں اعلیٰ درجات کا بیان ہو رہا ہے اور اس میں دو شرطیں ہیں۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں ایک جگہ ’’انذار‘‘ کا اور دوسری جگہ ’’تبشیر‘‘ کا رنگ ہے۔ حضور ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا:﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۱۰۵﴾ (بنی اسرائیل) ’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر۔‘‘ سورۃ الکہف میں جمع کے صیغے میں آیا ہے:﴿ وَمَا نُرْسِلُ

الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ (الکھف:۵۶) ’’اور ہم نہیں بھیجتے رہے اپنے رسولوں کو مگر مبشّر اور نذیر بنا کر۔‘‘ حضورﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝۸﴾ (الفتح) ’’بے شک ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔‘‘ پھر جمع کے صیغے میں فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾ (النساء)

’’خوش خبری دینے والے اور خبردار کرنے والے رسول (ہم نے) بھیجے تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حُجّت نہ رہے۔ اور اللہ بہت غالب‘ بڑی حکمت والا ہے۔‘‘

ایک ہے تبشیر یعنی بشارت دینا اور ایک ہے انذار یعنی خبردار کرنا۔ تربیت کے دوران ان دونوں چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دھمکی اس حوالے سے کہ اپنے رویے کو درست کرلو ورنہ پکڑ ہوگی‘ سزا ملے گی‘ جبکہ کبھی شاباش دی جاتی ہے کہ ہمت کرو‘ گھبراؤ نہیں‘ تمہارے اندر صلاحیت ہے۔ مایوس نہ ہو‘ تمہاری ہمت کیوں جواب دے رہی ہے! تم بڑے ذہین ہو‘ محنت کرو‘ بڑے اعلیٰ درجات ملیں گے۔ قرآن مجید میں یہ دونوں رنگ اختیار کیے گئے ہیں‘ یعنی تبشیر اور انذار۔ سورۃ العصر میں اِنذار کا رنگ غالب ہے کہ خبردار‘ تمام انسان ہلاکت اور بربادی کا نوالہ بننے والے ہیں سوائے ان کے جو چار شرطیں پورا کریں۔ درحقیقت یہ چاروں کامیابی کی کم از کم شرائط (minimum prerequisites) ہیں۔ ان سے کمتر پر نجات کا کوئی سوال ہی نہیں۔

پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ اس سورہ میں کامیابی اور ناکامی کا معیار سامنے آیا۔ دوسری یہ کہ اس میں کامیابی کی کم سے کم شرائط کا بیان ہے۔ تیسری چیز یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ چاروں شرطیں لازم ہیں۔

ابھی ہم نے کسی لفظ کی گہرائی میں اتر کر غور نہیں کیا‘ سرسری طور پر تذکّر بالقرآن کے

مرحلہ میں ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ایچی سن کالج لاہور میں سورۃ العصر پر تقریر کی تھی تو طلبہ کے ذہن کی مناسبت کے اعتبار سے کہا کہ یہ فرسٹ ڈویژن کا بیان نہیں بلکہ تھرڈ ڈویژن میں کامیابی کا بیان ہے جس سے کم تر پر failure ہے۔ یہاں اِنذار کا رنگ غالب ہے۔ خبردار کرنے والا انداز ہے۔ زجر کا‘ ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے کہ اگر کامیابی چاہتے ہو تو یہ چار شرطیں پوری کرو۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے لیے چار شرطیں بیان کی ہوں تو سوچیے کیا مجھے یہ اختیار ہے کہ ان میں سے ایک کم کردوں‘ دو کم کردوں‘ تین کم کردوں؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ کسی چیز میں کسی کو یہ اختیار نہیں۔ اگر ایسا کوئی اختیار ہوتا تو رسول اللہﷺ کے پاس ہوتا‘ مگر جب مشرکینِ مکہ نے مطالبہ کیا کہ اے محمد (ﷺ) یہ قرآن بہت rigid ہے‘ بہت سخت ہے‘ uncompromising ہے‘ یہ کہیں بھی کوئی رعایت کرنے کو تیار نہیں ہے تو اس قرآن پر ہمارا اور آپ کا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ اس قرآن میں کوئی ترمیم کیجیے یا کوئی اور قرآن لے کر آیئے۔ ایسے میں رسول اللہﷺ سے سورۂ یونس (آیت ۱۵) میں کہلوایا گیا:

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ﴾

’’(اے نبیﷺ! ان سے) کہہ دیجیے: میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ مَیں قرآن میں اپنے جی سے کوئی ترمیم (کوئی تبدیلی) کردوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جارہا ہے۔‘‘

غور کیجیے قرآن بیان کر رہا ہے کہ نجات کی چار شرطیں ہیں جبکہ میرے اور آپ کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ صرف کلمہ گو ہونا نجات کے لیے کافی ہے‘ صرف ایمان سے نجات ہوجائے گی۔ درحقیقت ایک نجات وہ ہے جو ہزار ہا برس تک جہنم میں جلنے کے بعد نصیب ہوگی۔ مَیں اُس نجات کی بات نہیں کر رہا۔ یقیناً جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ اپنے اعمال کی‘ اپنے کرتوتوں کی سزا بھگت کر بالآخر جہنم سے نکالا جائے گا اور اُس وقت حال یہ ہوگا جیسے جلا ہوا کوئلہ۔ یہ شرح حدیث نبویؐ میں آئی

ہے۔ یہ نجات نہیں ہے۔ نجات دراصل وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں ہی ہماری مغفرت کا اعلان فرما دیں۔ اوّل مرحلہ میں ہی ہمیں جنت میں داخل فرمائیں۔ یہاں اُس نجات کی بات کی جارہی ہے۔ جان لیجیے کہ وہ نجات محض کلمہ گو ہونے کی بدولت نہیں ملے گی۔ اس نجات کے لیے شرط اول ایمان‘ شرط دوم عملِ صالح‘ شرطِ ثالث تواصی بالحق اور چوتھی شرط تواصی بالصبر ہے۔ یہ قرآن مجید کا بیان ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے کہ اس میں ترمیم کی جاسکے۔ یہ چار شرطیں پوری ہوں گی تو نجات ہوگی۔

میں اس کے لیے ایک سادہ سی مثال دیا کرتا ہوں۔ آپ کسی حکیم کے پاس گئے۔ اس نے نبض دیکھ کر چار دوائیں لکھ دیں۔ اب اگر آپ نے اُس میں سے اپنی مرضی سے ایک دوا نکال دی اور تین رکھ لیں‘ یا دو نکال دیں اور دو استعمال کر لیں تو یہ نسخہ اب اُس حکیم کا نہیں ہے بلکہ آپ کا اپنا نسخہ ہے۔ ہوسکتا ہے یہ نسخۂ شفا نہ رہے بلکہ نسخۂ ہلاکت بن جائے۔ اس لیے کہ ہر وہ شخص جو نسخہ لکھتا ہے جانتا ہے کہ کسی مرض میں ایک ایسی دوا دی جاتی ہے جو بہت تیز ہے‘ مضر ہے مگر دینی بھی ضروری ہے تو اس کے ساتھ ایک مُصلح (corrective) بھی دیتے ہیں جو اس کے تیز اثر کو ختم کرتی ہے۔ وہ اس کے مضرت بخش پہلو کا ازالہ کر دے گی۔ اب اگر آپ نے وہ تیز دوا تو خوب استعمال کر لی اور اس کا جو مُصلح تھا اس کو ساقط کر دیا تو وہ یقیناً نسخۂ ہلاکت بن جائے گا۔ چنانچہ یہ چار اجزاء پر مشتمل نسخۂ نجات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اس کی چاروں شرطیں لازم ہیں۔ ان میں کوئی کمی بیشی کرنے کا اختیار ہمیں حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ العصر پر شائع شدہ کتابچہ میں مَیں نے امام رازیؒ کا ایک جملہ نقل کیا ہے جس سے اُن کی عظمت مجھ پر منکشف ہوئی۔ سورۃ العصر کی تیسری آیت کے بارے میں اُن کی تفسیر میں یہ الفاظ آتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الْآيَةَ فِيْهَا وَعِيْدٌ شَدِيْدٌ ’’جان لو اس آیت مبارکہ میں بڑی زبردست وعید ہے‘‘ اللہ کی طرف سے بڑی دھمکی ہے۔ کیوں؟

وَذٰلِكَ لِاَنَّهٗ تَعَالٰى حَكَمَ بِالْخُسَارِ عَلٰى جَمِيْعِ النَّاسِ، اِلَّا مَنْ كَانَ آتِيًا بِهٰذِهِ الْاَشْيَاءِ الْاَرْبَعَةِ، وَ هِيَ الْاِيْمَانُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ وَالتَّوَاصِيْ بِالْحَقِّ وَ التَّوَاصِيْ بِالصَّبْرِ، فَدَلَّ ذٰلِكَ اَنَّ النَّجَاةَ مُعَلَّقَةٌ بِمَجْمُوْعِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ

’’اس لیے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پوری نوعِ انسانی کی ہلاکت اور بربادی کا فیصلہ کر دیا ہے سوائے ان کے جو چار شرطیں پوری کریں‘ اور یہ ایمان‘ عملِ صالح‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ہیں‘ اور اس سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ نجات کا دارومدار ان چاروں کے مجموعہ پر ہے۔‘‘

جو بات اللہ تعالیٰ نے فرمائی‘ اس پر تاکید کا انداز ملاحظہ ہو: ﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ ’’زمانے کی قسم!‘‘ اللہ تعالیٰ تو بغیر قسم کھائے بھی جو بات فرمائے مستند ہے‘ اس کے فرمان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں‘ لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کسی بات پر زور دینا چاہتا ہے‘ چاہتا ہے کہ تمہیں پختہ یقین ہو جائے وہاں قسم کھا کر کہتا ہے۔

میں نے چار بنیادی باتیں تمہیدی طور پر عرض کی تھیں‘ تذکّر بالقرآن کے ضمن میں بھی چار ہی باتیں ہیں۔ جب اس سورۂ مبارکہ کو بحیثیت مجموعی ذہن میں رکھ کر نتیجہ نکالا جائے تو یہ نکات سامنے آتے ہیں:

(۱) اس میں کامیابی کا ایک معیار ہے۔
(۲) کامیابی کے کم سے کم لوازم کا بیان ہے۔
(۳) اس میں بیان کردہ چاروں چیزیں لازمی ہیں۔
(۴) یہ نہایت مؤکد کلام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔

سورۂ مبارکہ پر تدبّر

﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ اس کا ترجمہ یہی کیا گیا ہے کہ ’’زمانے کی قسم‘‘۔ گہرائی میں سمجھیے کہ یہ زمانے کی قسم کیوں کھائی جارہی ہے! سب سے پہلے یہ جانیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قسمیں کیوں کھائیں اور قسم کھانے سے مراد کیا ہے۔ ہم جب قسم کھاتے ہیں تو کسی عظیم ہستی کی قسم کھاتے ہیں ورنہ اس میں کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ قسم کا اصل مفہوم گواہی اور شہادت کا ہے۔ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ یہ بات درست ہے تو دراصل اس نے اللہ کو گواہ بنایا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں‘ وہ صحیح ہے۔ جب ہم قسم کھا کر کوئی وعدہ کرتے ہیں تو اس میں بھی گویا اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے ہیں: اَللّٰهُ

شَھِیْدٌۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ ’’اللہ گواہ ہے ہمارے اور تمہارے مابین۔‘‘ اب ہم دونوں کو اس معاہدے کی پیروی کرنی ہے اور اس کا ایفا کرنا ہے۔ لہٰذا انسان کی قسم کا اصل مفاد گواہی وشہادت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی ہیں‘ جیسے ﴿وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ﴾ ’’قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔‘‘ ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ ’’قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔‘‘ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا﴾ ’’قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔‘‘ ﴿وَالَّیْلِ﴾ ’’رات کی قسم‘‘ تو یہ مخلوقات کی قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قسموں میں کسی شے کی عظمت کا کوئی عمل دخل نہیں‘ اس لیے کہ یہاں قسم کھانے والا خود عظیم ترین ہے‘ اس سے عظیم تر کوئی شے ہی نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں کسی شے کی عظمت کا معاملہ نہیں بلکہ مجرد شہادت اور گواہی ہے۔ چنانچہ بامحاورہ ترجمہ ہو گا کہ زمانہ گواہ ہے!

لفظ ’’عصر‘‘ کا معنیٰ ومفہوم

عصر کا مَیں نے ترجمہ کیا زمانہ‘ لیکن زمانہ کے لیے عربی میں کئی الفاظ آتے ہیں‘ جیسا کہ زمان، وقت، دھر۔ دہر اور عصر ان دونوں الفاظ کو سمجھ لیجیے۔ جدید علوم والے لوگ جنہوں نے فزکس کا کچھ مطالعہ کیا ہے‘ وہ ان الفاظ کی گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں۔

آئن سٹائن ایک بہت بڑا Physicist تھا۔ اِس صدی کا عظیم ترین سائنس دان مانا گیا۔ مکان (space) کے حوالے سے ہمارا نظریہ ہے کہ یہ سہ ابعادی (three dimensional) ہوتا ہے۔ یعنی کسی شے کی تین اَبعاد (یا اَعراض) ہوتی ہیں: طول‘ عرض اور گہرائی یا اونچائی۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے‘ بلکہ آئن سٹائن نے یہ کہا ہے کہ Time is the fourth dimension of space‘ یعنی وقت درحقیقت مکان کی چوتھی جہت ہے۔ زمان ومکان (time and space) کی اصطلاح مرکب ہے۔ اس مرکب میں کُل کو لیں گے اور اس کا پھیلاؤ سامنے رکھیں گے تو اس کے لیے لفظ ’’دہر‘‘ آئے گا۔ جب اس کے لیے صرف وقت کا تصور رکھیں گے‘ وہ وقت جو گزرتا ہے

جس میں مُرور ہے‘ جس میں تین زمانوں (ماضی‘ حال اور مستقبل) کی تقسیم ہے‘ جسے انگریزی میں serial time کہا جاتا ہے‘ عربی میں اِسے زمانِ جاری کہیں گے۔ یہ ہے عصر‘ گزرنے والا زمانہ۔ وہ زمانہ جو اس وقت حال ہے‘ اگلے لمحہ وہ ماضی ہو گیا اور اس سے پہلے کے لمحے وہ مستقبل تھا۔ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے کہ ع ’’میں اپنی تسبیح روز وشب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!‘‘

یہ زمانہ جو ماضی‘ حال اور مستقبل میں گزرتا ہے اس کو عصر کہتے ہیں۔ چنانچہ اب اس کا ترجمہ ہو گا: ’’تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے۔‘‘ یہ زمانہ گزر رہا ہے‘ تمہیں اپنی غفلت کی وجہ سے ٹھہرا ہوا نظر آ رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ تم اپنی قبر سے قریب تر ہوتے جا رہے ہو۔ یہ چونکانے کا انداز ہے۔ ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

Every minute which is passing, it's bringing you nearer to your grave.

ہم نے میٹرک کے زمانے میں ایک انگریزی کی نظم پڑھی تھی A Psalm of Life۔ اس کا ایک قطعہ (stanza) ہے:

Art is long, and the time is fleeting,
And our hearts, though stout and brave,
Still, like muffled drums are beating,
Funeral marches to the grave.

جب کسی فوجی افسر یا بڑے شخص کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس کے تابوت کو لے کر جاتے ہیں تو ساتھ بینڈ بھی بجتا ہے۔ بینڈ کی ہر beat کے ساتھ وہ جنازہ اپنی قبر سے قریب تر ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ beating of heart ہے کہ دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ تم اپنی موت سے قریب تر ہوتے جا رہے ہو۔ یہ زمانہ جو اصل متاع ہے‘ اس میں ہمارے پاس یہ تھوڑی سی مہلت ہی ہے۔ اسی میں کچھ بنانا ہے۔ یہ مہلت تیزی سے گزر رہی ہے‘ جیسے برف پگھلتی ہے۔

امام رازیؒ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ ’’وَالْعَصْرِ ‘‘ کا مفہوم مجھے اُس وقت معلوم ہوا جب ایک شہر میں شام کے وقت داخل ہوا۔ بازار اب بند ہونے والا تھا کہ ایک برف بیچنے والا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: ’’لوگو! مجھ سے برف خرید لو‘ جلدی کرو‘ اس لیے کہ وہ پگھلی جا رہی ہے۔‘‘ ایک دکان دار تو وہ ہے جس کا سامان دکان کے اندر محفوظ ہے۔ وہ دکان بند کرے گا‘ اگلے دن کھولے گا تو اس کا سامان اسی طرح رکھا ہوا ہوگا۔ برف پگھل گئی تو اصل زر چلا گیا‘ سرمایہ ختم ہوا۔ چنانچہ انسان کی مثال اس برف کے تاجر کی سی ہے کہ ہر لحظہ وقت ختم ہو رہا ہے اور انسان اپنی منزل سے قریب تر ہو رہا ہے۔ اگر اِس میں اُس نے کچھ بنا لیا تو کامیابی ہے‘ لیکن اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر تباہی اور بربادی ہے۔ یہ انداز تیزی سے گزرنے والے زمانہ کا ہے۔

انسان کا عظیم ترین خسارا

اب آگے آیئے: ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾﴾ الانسان میں جو ’’ال‘‘ ہے اس کو ’’لامِ تعریف‘‘ کہتے ہیں اور اس میں بہت سے مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں مراد ہے تمام انسان۔ یہ لام حصر ہے۔ ’’اِنَّ‘‘ تاکید کے لیے آتا ہے۔ ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ﴾ ’’یقیناً تمام انسان‘‘ ﴿لَفِیۡ خُسۡرٍ ﴿۲﴾﴾ ’’درحقیقت خسارے میں ہیں۔‘‘ قرآن حکیم کی ہر آیت ایک معجزہ ہے۔ عربی زبان میں کسی چیز پر زور دینے کے لیے جتنے اسلوب ممکن ہیں وہ سب کے سب یہاں جمع کر دیے گئے ہیں۔ اِنَّ تاکید کے لیے‘ لامِ حصر تاکید کے لیے‘ فِیۡ خُسۡرٍ سے پہلے لَ (لامِ تاکید) ‘ پھر خُسۡرٍ نکرہ آیا ہے یہ بھی تاکید کے لیے۔ تو یہ جملہ اسمیہ تاکید یہ بنے گا۔

ذرا اس آیت پر نگاہوں کو مرتکز کیجیے کہ انسان کا خسارہ کیا ہے! آنکھیں کھول کر قلبِ حساس کے ساتھ نوعِ انسانی کا مشاہدہ کیجیے۔ کیسا کیسا دکھ‘ کون کون سی تکلیف‘ کتنی محنت‘ کتنی مشقت ہے جو ہر انسان کا مقدر ہے۔ سورۃ البلد میں اللہ تعالیٰ نے متعدد قسمیں کھا کر یہ بات کہی ہے:

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ﴿۴﴾﴾

’’یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔‘‘

یہ مشقت ہر انسان کا مقدر ہے۔ لوگ گھروں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس دنیا میں محنت اور مشقت کے لیے انسان کہاں کہاں جاتا ہے۔ ایک مغالطہ ہے کہ شاید محلات میں رہنے والوں کے لیے کوئی مشقت‘ کوئی دکھ نہیں‘ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ جو جتنا امیر ہے‘ اس کی جسمانی مشقت اگرچہ کم ہے مگر ذہنی کوفت زیادہ ہے۔ سکون آور دوائوں (tranquilizers) کی انہیں زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ انہیں خواب آور دوائیں (sedatives) چاہئیں۔ مزدور کو ان کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ آٹھ گھنٹے کی محنت کرنے کے بعد ایسا سوتا ہے کہ پھر صبح ہی کی خبر لے گا۔ دراصل کسی کی جسمانی مشقت ہے تو کسی کی ذہنی مشقت۔

مہاتما گوتم بدھ کے معاملہ پر غور کیجیے۔ تیس برس کی عمر میں کپل وستو کا شہزادہ محل کو چھوڑ کر نکل گیا۔ جوان بیوی کو سوتا ہوا چھوڑ دیا۔ شیرخوار بچے کو چھوڑ گیا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ باپ کے بعد یہ سلطنت مجھے ملنے والی ہے۔ کبھی آپ نے یہ سوچا کہ وہ کیوں گیا؟ اُس نے انسان کے غم اور دکھ کا مشاہدہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی اندھا ٹھوکر کھا کر گر رہا ہے‘ کوئی والدین رو رہے ہیں کہ وہ کچھ نہ کر سکے اور ان کی نگاہوں کے سامنے ان کا نہایت محبوب بچہ دم توڑ گیا۔ اس نے سوچا کہ انسان کے ساتھ یہ صدمہ کیوں ہے! یہ دُکھ انسان کا مقدر کیوں ہے؟ اِس صدمہ اور دکھ سے نجات پانے کی بھی کوئی شکل ہے کہ نہیں؟ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت‘ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے الفاظ میں‘ لدو اونٹ اور کولہو کا بیل بن کر زندگی بسر کر رہی ہے۔ جو آٹھ گھنٹے تک اینٹیں ڈھو رہا ہو‘ وہ واقعی انسان ہے یا حیوان بن گیا ہے! آٹھ گھنٹے کی اس محنت کے بعد بھی ہو سکتا ہے کہ دو وقت کی روٹی اُسے پوری نہ ملے۔ ایسا شخص کتنے بوجھ تلے دبا ہوا ہے‘ کتنی مشقت کے اندر پسا ہوا ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کے لیے دُکھ دیکھنے پڑتے ہیں۔ اپنی اولاد کے لیے رات کی نیندیں حرام کر لیتے ہیں۔ بچہ بخار میں تپ رہا ہے یا درد سے تڑپ رہا ہے تو نہ باپ سو سکتا ہے نہ ماں سو سکتی ہے۔ جس زمانے میں ابھی سوئی گیس نہیں آئی تھی اور اکثر و بیشتر مٹی کا تیل بطور ایندھن استعمال ہوتا تھا‘ میں نے دیکھا کہ لاہور میں کیروسین آئل

کی قلت ہوگئی تو دکانوں کے باہر کئی کئی فرلانگ لمبی قطاریں لگتی تھیں۔ ایسے ایسے منظر تھے کہ ایک برقع پوش خاتون گود میں ایک بچہ سنبھالے‘ دوسرے کی انگلی پکڑے‘ تیل کی بوتل ہاتھ میں لیے ہوئے کئی کئی گھنٹے دکان پر کھڑی ہے۔ یہ مشقت انسان جھیل رہا ہے۔ غالب نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں!

ہم بھول جاتے ہیں ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر قلب حساس ہو تو: ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

بنی آدم کا المیہ: محاسبۂ اُخروی

یہ تو ہوا انسان کا معاملہ کہ ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ﴿۴﴾﴾‘ جبکہ حیوانات کا معاملہ ایک اعتبار سے آسان ہے کہ ان سے کیا کوئی محاسبہ بھی ہے؟ کوئی جواب دہی بھی ہے؟ ان کو اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے؟ نہیں! یہ ٹریجڈی‘ یہ المیہ صرف انسان کا ہے۔ اس کو بھی سورۃ الانشقاق میں کئی قسمیں کھانے کے بعد فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ ﴿۶﴾﴾

’’اے انسان! بے شک تجھے (صدموں پر صدمے جھیلتے ہوئے) مشقت پر مشقت برداشت کرتے ہوئے ایک روز اپنے رب سے ملنا ہے۔‘‘

یعنی تیرا المیہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ صدموں پر صدمات جھیلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا بھی ہونا ہے‘ جواب دہی بھی کرنی ہے۔

اُس دن کے احساس سے تو ہماری اُمّت کے جو بڑے بڑے عظیم گلِ سرسبد ہیں‘ اُن کا حال بھی عجیب ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکر صِدّیق ؓ ایک عجیب کیف کے عالم میں فرمایا کرتے تھے:

’’کاش میں درختوں پر چہچہاتی ہوئی چڑیا ہوتا جس سے حساب کتاب نہ ہوتا۔
کاش میں گھاس کا تنکا ہوتا جو آج ہے اور کل آگ میں جلا دیا جاتا ہے‘ ختم ہو جاتا ہے‘ اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوتا۔‘‘

حضرت عمر فاروق ؓ اپنے انتقال کے وقت سخت بے چین تھے کہ بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تو فرمایا کہ نیچے ڈال دو۔ ایک عجیب بے کلی اور بے چینی تھی۔ بیٹے نے کہا: ابا جان آپ کیوں پریشان ہیں؟ آپ تو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے ذریعہ سے اس دنیا میں جنت کی بشارت دے دی ہے۔ حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں:

’’خدا کی قسم‘ اگر قیامت کے دن عمر برابر سرابر پر بھی چھوٹ گیا تو بہت بڑی کامیابی تصور کرے گا۔‘‘

یہ ان لوگوں کے احساس کا عالم تھا۔ حضرت علی ؓ کا یہ حال تھا کہ ایک تیر پیوست ہو گیا تھا جو کسی طرح نکل نہیں رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا: ’’اچھا چھوڑ دو مجھے‘ میں نماز کی نیت باندھتا ہوں۔‘‘ جب نماز کی نیت کرتے تو لرزتے اور کانپتے تھے کہ کس کے سامنے کھڑا ہوں اور کس کے سامنے مجھے ایک دن جواب دہی کے لیے کھڑا ہونا ہوگا۔ چنانچہ اسی حالت میں وہ تیر نکال دیا گیا۔ حضور ﷺ نے خبر دی ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ))

’’آدم کے بیٹے کے قدم قیامت کے دن اپنے ربّ کے پاس سے ہل نہیں سکیں گے‘‘

یعنی جیسے مجرم کٹہرے کے اندر کھڑا ہوتا ہے‘ اس کٹہرے میں سے ہل نہیں سکو گے۔

((حَتّٰی یُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ))

’’یہاں تک کہ اُس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ لیا جائے۔‘‘

وہ پانچ چیزیں کیا ہیں؟ کان کھول کر سنیے:

(۱) ((عَنْ عُمُرِهٖ فِیْمَ اَفْنَاهُ))

’’اُس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کہاں صرف کیا؟‘‘

عمر کا حساب دو۔ یہ ستر‘ اسّی برس ہم نے تمہیں دنیا میں دیے‘ کہاں ضائع کیے؟

(۲) ((وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَ اَبْلَاہُ))

’’اُس کی جوانی کے بارے میں کہ اسے کہاں کھپایا؟‘‘

اور خاص طور پر جوانی کا دور جو اُمنگوں کے دن ہوتے ہیں۔ ولولے ہوتے ہیں‘ قوت وتوانائی ہوتی ہے‘ آدمی چلتے ہوئے زمین پر پاؤں مارتا ہے۔ یہ جوانی کہاں لگائی؟ ایک ایک لمحے کا حساب دو۔

(۳) ((وَمَالِہٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَہٗ))

’’اُس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا؟‘‘

ایک ایک پائی کا حساب دو۔ مال کہاں سے کمایا تھا‘ حلال سے یا حرام سے؟

(۴) ((وَفِیْمَ اَنْفَقَہٗ))

’’اور کس چیز میں خرچ کیا؟‘‘

گُل چھروں میں‘ عیاشیوں میں یا نیکی کے کاموں میں‘ ادائے حقوق میں‘ اللہ کے دین کے لیے؟

یہ چار سوال ہو گئے۔ دو زندگی کے بارے میں۔ ایک پوری زندگی بحیثیت مجموعی کہاں‘ کس کام میں لگائی اور خاص طور پر شباب کا دور کہاں لگایا۔ دو سوال مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا! حلال سے کہ حرام سے‘ جائز سے کہ ناجائز سے؟ خرچ کہاں کیا؟

(۵) ((وَمَا ذَا عَمِلَ فِیْمَا عَلِمَ)) (سنن الترمذی:۲۴۱۶)

’’اور اُس کے علم کے بارے میں کہ اس پر کہاں تک عمل کیا؟‘‘

علم کے انبار لگاتے چلے گئے جبکہ عمل کے آغاز کی نوبت ہی نہ آئی۔ یہ علم اُس روز سب سے بڑا وبال بن جائے گا۔ اتنا علم اور عمل کچھ نہیں! بجائے یہ کہ credit کا ذریعہ بنے‘ الٹا debit کا کھاتا بن جائے گا۔

یہ جواب دہی کا احساس ہے کہ جس کی وجہ سے انسان کی ٹریجڈی دوہری ہے۔ کوئی حیوان اتنے بوجھ تلے نہیں ہے۔ اس نے جو محنت ومشقت کی وہ اس زندگی میں ہی ختم

ہو جائے گی۔ اس کے بعد کوئی محاسبہ نہیں ہے۔ اس کو ابراہیم ذوق نے خوب کہا کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے!

یہ ہے انسانی زندگی کا المیہ۔

اب غور کریں تو ایک گوتم بدھ کا فلسفہ ہے۔ اس کے فلسفہ کی main theme ہے: ’’سروم دکھم دکھم‘‘ (جیون دکھ ہی دکھ ہے) All is pain, all is suffering۔ اس نے جو بھی محنت کی‘ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسے بعد میں کیا ملا اور کیا نہیں۔ ایک بہت جید عالم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جن کا برصغیر پاک وہند کے علماء میں بہت اونچا مقام ہے‘ انہوں نے گوتم بدھ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور اس کی دلیل دی ہے۔ قرآن مجید میں ایک رسول کا ذکر آتا ہے: ’’ذوالکفل‘‘ جن کے بارے میں ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ذکر آیا لیکن کسی حدیث میں ان کے بارے میں وضاحت نہیں ملتی۔ نہ حضورﷺ سے پوچھا گیا‘ نہ حضورﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی۔ تورات میں نبیوں کے جو نام آتے ہیں ان میں کسی نبی کا نام ذوالکفل کے آس پاس نہیں بنتا کہ سمجھا جائے کہ یہ اُس نام کی بگڑی ہوئی یا بدلی ہوئی شکل بن گئی ہو گی۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے جو کہا وہ بات وزنی معلوم ہوتی ہے‘ اس اعتبار سے کہ کپل وستو میں کپل کی جو ’’پ‘‘ ہے وہ عربی میں ’’ف‘‘ بنتی ہے۔ یوں ذوالکفل کے معنی ہوئے: ’’کفل والا‘‘ جس کو ہم کہتے ہیں کپل وستو کا شہزادہ۔ انہوں نے کہا کہ گوتم بدھ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ بھی اللہ کے نبی تھے‘ اگرچہ ہم یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے‘ ہم واللہ اعلم کہیں گے لیکن یہ امکان ضرور موجود ہے‘ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ ۷﴾ (الرعد) ’’ہم نے ہر قوم میں ہادی بھیجے ہیں۔‘‘

اور یہ بھی فرمایا گیا:

﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ ۲۴﴾ (فاطر)

’’اور کوئی اُمت ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو۔‘‘

یہ ممکن نہیں کہ کسی علاقے میں کوئی نبی نہ آیا ہو‘ لیکن ان کی تعلیمات اتنی بدل گئی ہیں کہ ہم

ان کو پہچان نہیں سکتے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اگر عیسائیوں سے ہم سمجھیں گے تو کبھی بھی انہیں اللہ تعالیٰ کے نبی نہیں مان سکتے۔ یہ تو قرآن مجید نے آ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حقیقت بتائی ہے۔ بہرحال ہو سکتا ہے کہ گوتم بدھ اللہ تعالیٰ کے نبی ہوں مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ گوتم بدھ نے دُکھ‘ رنج‘ صدمہ‘ غم جو انسان کا مقدر ہے اس کا مشاہدہ کیا اور پھر تپسیائیں کیں‘ علم حاصل کیا۔ یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس دکھ سے نجات پانے کی کوئی سبیل بھی ہے کہ نہیں! اس غم سے انسان کسی طریقے سے چھوٹ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کو انگریزی میں salvation اور ہندی میں ’’نرمان‘‘ کہتے ہیں۔ اسی کو عربی میں ’’نجات‘‘ کہتے ہیں۔ مَیں نے امام رازی کے الفاظ میں اِسے بتایا: اَنَّ النَّجَاۃَ مُعَلَّقَۃٌ بِمَجْمُوْعِ ھٰذِہِ الْاُمُوْرِ کہ نجات کا دارومدار ان تمام چیزوں کے مجموعے پر ہے۔

اُمید کی کرن

جدید فلسفوں میں ایک فلسفۂ وجودیت (Existentialis m) ہے۔ اس کا مرکزی خیال بھی یہی ہے کہ انسان کے لیے دکھ ہی دکھ ہے‘ صدمہ ہی صدمہ ہے‘ رنج ہی رنج ہے۔ کچھ حساس لوگ ہوتے ہیں جو صدمے کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کی حس dull ہو جاتی ہے‘ کند ہو جاتی ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ دکھ سے نجات کا کوئی راستہ ہے بھی کہ نہیں! اس سوال کا جواب سورۃ العصر کی تیسری آیت ہے: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۳﴾ پہلی دو آیات ﴿وَالْعَصْرِ ۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۲﴾ سے جو ایک مایوس کن صورتِ حال سامنے آتی ہے‘ اس سے نجات دلانے والی تیسری آیت ہے۔ یہ اُمید کی کرن ہے کہ تباہی سے بچ سکتے ہو‘ ابدی بربادی سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ اس دنیا میں ہم نے مشقتیں اٹھا لیں‘ تکلیفیں جھیل لیں‘ صدمے برداشت کر لیے لیکن موت آئی تو ان کا خاتمہ ہو گیا۔ جہنم کی آگ کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا کہ اگر انسان کی ایک کھال جل جائے گی‘ جھلس جائے گی تو اللہ تعالیٰ دوسری کھال دے دے گا۔ جدید دور کے فرانسیسی سرجن موریس بوکائے نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنے natural phenomena

کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بالکل سائنس کے مطابق ہیں۔ آج ہمیں یہ معلوم ہے کہ حِس صرف کھال میں ہوتی ہے۔ کھال حساس ہوتی ہے۔ کھال اتر جائے تو نیچے کا گوشت جلنے پر تکلیف نہیں ہو گی۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب ان کی کھالیں جھلس جائیں گی تو ہم نئی کھال دے دیں گے تاکہ سوزش اور جلن کا احساس برقرار رہے‘ وہ ختم نہ ہونے پائے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ﴾ (النساء: ۵۶) ’’جب ان کی کھالیں جھلس جائیں گی (جل جائیں گی) تو ہم ان کی کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔ مگر حال یہ ہو گا: ﴿ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی ۱۳﴾ (الاعلیٰ) ’’پھر نہ وہ اس میں جی سکے گا نہ مر سکے گا‘‘۔ نہ زندوں میں ہو گا‘ نہ مُردوں میں ہو گا۔ موت کو پکارے گا کہ کاش وہ آ کر مجھے اس مشقت سے‘ اس مشکل سے چھٹکارا دلا دے۔ وہ موت جس سے اس وقت ہم بھاگتے ہیں‘ اگر خدانخواستہ جہنم میں جھونکے جائیں گے تو پھر موت کو پکاریں گے‘ لیکن وہ نہیں آئے گی۔

اس عذاب سے‘ اس ابدی ناکامی سے‘ اس خسران سے‘ اس ابدی ہلاکت سے بچنے کا کوئی راستہ ہے؟ وہ جو میدانِ حشر میں لوگ پکاریں گے: ﴿اَیْنَ الْمَفَرُّ ۱۰﴾ (القیامۃ) ’’ہے کوئی جائے فرار؟‘‘ ہے کوئی جائے پناہ؟ وہ جائے فرار‘ وہ جائے پناہ‘ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی جس کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۳﴾ یہ ایک راستہ ہے جس کے چار نشان ہائے راہ ہیں‘ سنگ ہائے مِیل ہیں۔ پہلا ایمان‘ دوسرا عمل صالح‘ تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا تواصی بالصبر۔ اس صراطِ مستقیم پر چلو گے تو نجات حاصل ہو جائے گی‘ کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ گے‘ ابدی خسران سے نجات پا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ اے اللہ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما!

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِکَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ----- آمین یا ربّ العَالَمِین!!

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۵)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آیت ۱۰ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰﴾ ’’اُن کے دلوں میں ایک روگ ہے‘ تو اللہ نے ان کے روگ میں اضافہ کر دیا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس جھوٹ کے سبب جو وہ بول رہے تھے۔‘‘

مرضِ قلب کی وضاحت

فرمایا کہ ان کے دلوں میں ایک روگ ہے‘ مرض ہے‘ بیماری ہے‘ اور اس بیماری کو معیّن نہیں کیا گیا کہ وہ کون سی بیماری ہے۔ اگر تاویلِ خاص کو سامنے رکھیں کہ اس میں روئے سخن یہود کی طرف ہے تو وہ مرض ’’حسد‘‘ تھا جو علماءِ یہود کی مذہبی چودھراہٹ اور تکبر کا عکس اور اُسی کا نتیجہ تھا۔ وہ اس روگ میں مبتلا تھے کہ یہ مقامِ فضیلت ہم سے کیوں سلب ہوا جو دو ہزار برس تک ہمارا امتیازی مقام تھا۔ وحی اور نبوت کے مہبط ہم تھے‘ سارے نبی ہماری نسل میں سے اُٹھتے رہے‘ کتابیں ہمیں دی گئیں۔ مذہبی چودھراہٹ اور سیاسی قیادت و سیادت پر ہم علماءِ یہود فائز تھے۔ آج یہ چیز ہم سے چھین کر دوسروں کو دے دی گئی! دراصل تکبر اور حسد ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یہی ان کا مرض تھا۔ اسی لیے یہاں لفظ مرض کو مبہم رکھا گیا‘ واضح نہیں کیا گیا۔ منافقین کا اصل مرض حُبِّ جان‘ حُبِّ مال یا یوں کہیے حُبِّ دنیا کی بنیاد پر بزدلی تھا۔ جان بھی عزیز ہے‘ مال بھی عزیز ہے۔ اسلام بھی عزیز ہے‘ لیکن اسلام کے لیے جان اور مال کی قربانی جھیلنے کے لیے تیار نہیں۔

از خود کچھ ہو جائے تو ہو جائے۔

مجھے لطیفے کے درجہ میں بات یاد آئی‘ کراچی میں ہمارے ایک بزرگ ساتھی ہیں‘ بہت بذلہ سنج‘ وہ ایک تلخ حقیقت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا کرتے ہیں: ’’اللہ حق‘ رسولؐ حق‘ قرآن حق‘ دین حق‘ لیکن پیٹ برحق۔‘‘ یہ مسئلہ جب ایک ضعفِ ارادہ والے انسان کے سامنے آتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ ہاں یہ سب کچھ حق ہے‘ لیکن جان و مال کا نقصان برداشت کرنا گوارا نہیں۔ اس کے برعکس پختہ عزم و ارادہ والے لوگ ع ’’ہر چہ بادا باد‘ ما کشتی در آب انداختیم‘‘ کی شان کے ساتھ آتے ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے‘ ترا آئینہ ہے وہ آئینہ\
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

لیکن کچھ لوگ جن کی یہ کیفیت نہیں‘ جیسا کہ غالب نے کہا ع ’’جس کو ہو جان و دل عزیز‘ اُس کی گلی میں جائے کیوں!‘‘ اُس گلی میں داخل تو ہو گئے ہیں مگر جان بھی عزیز ہے‘ مال بھی عزیز ہے‘ کسی شے کا نقصان گوارا نہیں ہے تو وہ مذبذب ہو کر رہ جائیں گے۔ دُنیا کے تمام متعلقات اس کے ذیل میں آ جائیں گے۔ اولاد بھی پیاری ہے‘ اہل و عیال سے محبت بھی ہے‘ گھر بھی پیارا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ التوبہ کی وہ آیت ذہن میں لے آیئے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے: اگر تمہیں اپنے باپ‘ اپنے بیٹے‘ اپنے بھائی‘ اپنی بیویاں‘ اپنے رشتہ دار‘ اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کما کر جمع کیے ہیں‘ اور اپنی وہ تجارتیں جن کے کساد اور مندے کا تمہیں خوف لاحق رہتا ہے‘ اور اپنی وہ حویلیاں (اور جائیدادیں) جو تمہیں بہت پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) محبوب تر ہیں اللہ سے‘ اُس کے رسول (ﷺ) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے

سے تو جاؤ انتظار کرو‘ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

وہی قانون یہاں آ رہا ہے: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ’’ان کے دلوں میں ایک روگ ہے تو اللہ نے بڑھا دیا ان کا یہ روگ۔‘‘ یہ بڑھانا کس اعتبار سے ہے؟ یہ اس اعتبار سے کہ آگے جو فرمایا گیا: ﴿وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان کی رسّی دراز کر رہا ہے‘ ان کا پردہ چاک نہیں کر رہا۔ ان کی رسّی دراز ہو رہی ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے۔ دیکھو ہم بچ گئے۔ مرحلہ سخت آیا تھا‘ ہم نے جھوٹا بہانہ بنا کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ یہ مسلمان بیچارے‘ یہ جو دیوانے (fanatics) ہیں‘ یہ جان جوکھوں کے کام کرتے پھر رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا جھوٹ ہی تو بولنا تھا۔ ہم نے ذرا سا بہانہ بنایا‘ معذرت کی اور رخصت لے کر آ گئے۔ چنانچہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے‘ درآنحالیکہ وہ اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں۔ جیسے جیسے رسّی ڈھیلی کی جا رہی ہے یا ڈھیل دی جا رہی ہے‘ ان کا مرض بڑھ رہا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جس کی آخری شکل آیت ۷ میں بیان ہو چکی ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ....﴾

واپسی ناممکن!

قانونِ ہدایت و ضلالت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی کی تمیز دے دی اور اس میں انتخاب کا اختیار (choice) بھی دے دیا۔ خارج میں بھی داعیانِ حق و خیر بھی ہیں اور داعیانِ شر بھی۔ انسان کے اندر بھی کسوٹی موجود ہے۔ اسے عقل بھی دے دی گئی اور نیکی و بدی کی تمیز بھی ودیعت کر دی گئی: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾۔ اب جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ‘ لیکن یاد رکھو کہ خیر کے راستے پر بڑھو گے تو اللہ تعالیٰ راستہ کشادہ کرتے چلیں جائیں گے۔ شروع میں بڑی مشکل نظر آئے گی‘ جب آگے بڑھو گے تو معلوم ہو گا آسانی ہے‘ کوئی اتنی بھی مشکل نہیں۔ بڑا کٹھن مرحلہ نظر آ رہا تھا لیکن یہ تو اتنا کٹھن ثابت نہیں ہوا۔ اللہ اس کو آسان بناتا چلا جاتا ہے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾۔ اس کے برعکس اگر غلط راستہ اختیار کرو گے تو اللہ وہ کھول دے گا‘ اس پر چلنا آسان

کر دے گا کہ اس پر بڑھتے چلے جاؤ! آج چھوٹے درجے کی بے حیائی تھی‘ کل اس سے دس گنا بڑھ کر بے حیائی کا ارتکاب کرو گے۔ پھر بے حیائی میں بڑھتے چلے جاؤ گے‘ یہاں تک کہ نیکی اور بدی کو پہچاننے کی حس ختم ہو جائے گی‘ حق کی طرف مراجعت کا اب امکان ہی نہیں رہے گا‘ جس کو کہتے ہیں: point of no return کہ اب واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ ایک حد ہوتی ہے جس میں آدمی واپس آ سکتا ہے۔ اُس حد سے گزرنے کے بعد ایک انتہا وہ آتی ہے کہ پھر آدمی واپس آ ہی نہیں سکتا۔ اس کو قرآن کہتا ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (البقرۃ:۷) یا ﴿طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (النحل:۱۰۸) کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

یہاں بھی فرمایا: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ ’’ان کے دلوں میں ایک روگ تھا۔‘‘ انہوں نے اسی کی پیروی کی۔ تکبر کی پیروی کی‘ یا حُبِّ دُنیا انہیں لے کر بیٹھی رہی‘ انہیں آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا: ﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾۔ یہی بات سورۃ الصّف میں آئی ہے: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ﴾ ’’جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔‘‘ ٹیڑھ کی آخری انتہا وہی ہے کہ دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ یہاں جو فرمایا: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ تو یہ دونوں طرف قابلِ اطلاق (applicable) ہے۔ علماء یہود کے دلوں میں اپنا پندار‘ غرور اور اس کی بنیاد پر حضور ﷺ اور اہلِ ایمان سے حسد۔ دوسری طرف منافقین کا مرض حُبِّ دُنیا‘ حُبِّ مال‘ حُبِّ اہل وعیال‘ حُبِّ جائیداد‘ یعنی دنیا اور اس کی متعلقات کی محبتیں۔ بقول غالب ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے‘ کلیسا مرے آگے!

ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾ (النسا:۱۴۳) ’’یہ اس کے درمیان مذبذب (ہو کر رہ گئے) ہیں‘ نہ تو یہ اِن کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں۔‘‘ چلنا چاہتے بھی ہیں تو چل نہیں پاتے‘ ہمت جواب دے

جاتی ہے‘ وگرنہ بات اچھی لگتی ہے۔ بدنیتی سے نہیں آئے تھے۔ بدنیتی سے تو جو آئے وہ شعوری منافق تھے جو سازش کے طور پر شامل ہوئے اور ایک وقتِ معیّن طے کر کے آئے تھے کہ بس اتنا عرصہ رہیں گے۔ صبح کے وقت ایمان کا اعلان کرو اور شام کو مرتد ہو جاؤ‘ واپس آ جاؤ۔ اس طرح کچھ نہ کچھ کو تو اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے ہی آؤ گے۔

﴿وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمُۢ بِمَا كَانُواْ يَكۡذِبُونَ ١٠﴾ ’’اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بسبب اُس جھوٹ کے جو وہ بولتے رہے۔‘‘ یا ’’بسبب اُس جھوٹ کے جو وہ کہتے رہے۔‘‘

یہ بڑا باریک سا فرق ہے‘ اس لیے عام مفسرین جنہوں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں کی‘ یہی ترجمہ کیا ہے: ’’اُس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے۔‘‘ جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے‘ لیکن اس پر عذابِ الیم کی وعید اور اس شدّت سے اس پر نکیر اور اتنی سخت گرفت‘ یہ کچھ متناسب (proportionate) معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ اور انہی کے تتبع (پیروی) میں شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے کہ ’’جھوٹ کہتے رہے‘‘ یعنی وہ اپنے ایمان کا دعویٰ جو کر رہے تھے وہ جھوٹا تھا۔ چاہے وہ یہود جو کہتے تھے کہ ہم بھی مؤمن ہیں‘ حقیقتاً وہ مؤمن نہیں۔ ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے‘ ان کا یہ قول جھوٹ پر مبنی ہے۔ اسی طرح منافقین جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے وہ بھی جھوٹ تھا اور ان کے جھوٹے دعوے کی پاداش میں ان کے لیے دردناک‘ الم ناک عذاب ہے۔

آیت ۱۱ ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ قَالُوٓاْ إِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُونَ ١١﴾ ’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد کرو زمین میں‘ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔‘‘

وہ کہتے ہیں ہم تو صلح جُو لوگ ہیں‘ مصالحت چاہتے ہیں‘ اصلاح کے لیے کوشاں ہیں۔

آیت ۱۲ ﴿أَلَآ إِنَّهُمۡ هُمُ ٱلۡمُفۡسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشۡعُرُونَ ١٢﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں‘ مگر انہیں شعور نہیں ہے۔‘‘

فساد فی الارض کی اصل حقیقت

ان دو آیتوں کے اصل مفہوم کو سمجھنے کے لیے کچھ صُغریٰ کُبریٰ سمجھانا پڑے گا۔ از روئے قرآن فساد فی الارض کیا ہے؟ یہ زمین اللہ کی ہے‘ اللہ ہی اس کا حاکمِ حقیقی ہے‘ اُسی کی مرضی کے مطابق یہاں انسان کو زندگی گزارنی چاہیے۔ یہ ہے اصل میں حق‘ یہ ہے امن۔ اس کے خلاف جو روِش بھی ہے وہ فساد ہے‘ بغاوت ہے۔ ایک شخص خود بادشاہ بن کر بیٹھ گیا اور اپنی مرضی کا مالک ہے تو وہ گویا اپنی خدائی کا دعویدار ہے۔ مولانا رومؒ نے تو یہاں تک کہا ہے ۔

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
آں کہ او را عون ما را عون نیست!

یعنی ہمارا نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ یہ بھی خدائی کا مدّعی ہے کہ یہ وجود میرا ہے‘ اس پر میری مرضی چلے گی۔ مجھے یہ شے پسند ہے‘ اس کا حصول جائز ہے یا ناجائز‘ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے تو بس یہ شے ملنی چاہیے کہ یہ میری طلب ہے۔ فرعون کے پاس معاونت تھی‘ مدد تھی‘ لاؤلشکر تھا‘ اختیارات تھے تو اُس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا: ﴿أَنَا۠ رَبُّكُمُ ٱلۡأَعۡلَىٰ ٢٤﴾ (النازعات)۔ جبکہ ہمارے پاس اختیارات نہیں ہیں۔ چنانچہ زبان سے تو ہم کچھ نہیں کہتے‘ لیکن ہمارا نفس اندر یہی خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ درحقیقت یہی فساد ہے۔ انفرادی سطح پر فساد اللہ کی بندگی کی بجائے اپنے نفس کی بندگی‘ معاشرے کی بندگی‘ زمانے کے چلن کی پیروی کرنا ہے۔ ع ’’چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!‘‘ اس کیفیت میں بظاہر آپ جتنے بھی امن میں ہیں‘ حقیقت میں آپ کی زندگی میں فساد ہے۔ اسی طرح ایک معاشرہ جو بغاوت پر مبنی ہے‘ جیسے ڈاکوؤں کا ایک اڈا ہو۔ ڈاکو باہر ڈاکے مارتے ہیں‘ آپس میں تو ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہتے‘ اپنے اڈے میں وہ بڑے پُرامن ہیں‘ لیکن اس کو فساد ہی کہا جائے گا‘ کیونکہ درحقیقت یہ فساد کی جڑ اور بنیاد ہے‘ نہ کہ امن کا گہوارہ۔ اگر کسی جگہ پر بہت سے سانپ اور بچھو ہوں اور وہ ایک دوسرے کو ڈس نہ رہے ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہاں امن ہے۔ حقیقت میں تو

ان کی فطرت کے اندر فساد موجود ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی اصطلاح میں اصل امن یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام‘ انفرادی و اجتماعی سطحوں پر اللہ جل شانہ کی مرضی کے مطابق چلایا جائے۔ اس کے خلاف جو بھی روش ہو‘ چاہے وہ بظاہر کتنا ہی پُرامن معاشرہ ہو‘ وہ فساد کی آماج گاہ ہے۔ امریکی معاشرے میں یوں تو نظر آتا ہے کہ لوگ بڑے مہذب ہیں‘ خوش اخلاق ہیں‘ ایک دوسرے کے حقوق کا بڑا پاس اور لحاظ کرنے والے ہیں‘ لیکن جنہیں یہ شعور ہو کہ امریکی استعمار کس طرح پوری دنیا کا استحصال (exploitation) کر رہا ہے‘ لوگوں کی محنت مزدوری سے کمائی ہوئی دولت کس طرح کھینچ رہا ہے‘ انہیں معلوم ہے کہ یہ ڈاکو ہیں۔ یہ امپیریلزم پوری نوعِ انسانی پر ڈاکا ہے۔ اپنے طور پر یہ ڈاکوؤں کا اڈا ہے جس نے انہیں امن فراہم کیا ہے۔ چنانچہ فساد اور امن کی اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اب اگر کہیں فساد ہے یعنی زندگی کا ہر پہلو اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے تو یہ اللہ کی جناب میں بغاوت ہے‘ چاہے وہاں امن نظر آئے۔ مکہ میں بھی بڑا امن تھا۔ جو بھی ظلم ہو رہے تھے‘ غلاموں پر ہو رہے تھے اور وہ بیچارے برداشت کر رہے تھے‘ کوئی چیخ پکار نہیں تھی۔ بظاہر بڑا امن تھا لیکن نظام غلط تھا۔ اس مفسدانہ اور فاسقانہ نظام کو بدلنے کے لیے نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے ساتھی ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ (الفتح:۲۹) کوشاں ہوئے۔ ماحول کے اندر ایک تصادم پیدا ہوا۔ اسی کا اگلا مرحلہ مدنی دَور میں آیا جس میں جنگ و جدال بھی ہے: ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۹۰) ’’اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔‘‘ درحقیقت یہاں اس فساد کو ختم کرنے کے لیے جنگ کی جا رہی ہے‘ بظاہر خون ریزی کی جا رہی ہے لیکن یہ امن ہے۔ البتہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ نہیں بھئی‘ لڑو بھڑو نہیں‘ امن سے رہو‘ چلو باطل سے کچھ مفاہمت (reconcile) کر لو‘ کچھ ان سے اپنی منوا لو‘ کچھ ان کی مان لو‘ بجائے اس کے جو تم اس جِدّوجُہد میں اپنا بھی نقصان کر رہے ہو‘ اپنے لیے بھی مسائل اور مشکلات پیدا کر رہے ہو‘ خود بھی قربانیاں دے رہے ہو اور دوسروں کا بھی بہرحال خون گر رہا ہے‘ اس سب کو چھوڑو اور امن کی کیفیت اختیار کرو‘ یہ اصل میں فسادی ہیں۔

اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کی مخالفت: فساد

اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت فی الارض کو رفع کرنے کے لیے اللہ کے وفادار بندے ایک جماعت اور جمعیت کی شکل میں باطل کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو اب جو کوئی اس راستے میں رکاوٹ بنے گا وہ فساد فی الارض کا مرتکب ہو گا۔ چاہے وہ مصالحت کے نام پر ہو‘ چاہے صلحِ کُل ہونے کے اعتبار سے ہو‘ چاہے کہا جا رہا ہو کہ یہ لڑنا بھڑنا کاہے کو‘ رواداری ہونی چاہیے‘ بڑے خوش نما عنوانات ہوں لیکن حقیقت میں یہ فساد ہے۔ یہاں وہ کردار سامنے آ جاتا ہے جو منافقین کا تھا۔ اصل میں تو جان و مال عزیز تھے‘ میدانِ کار میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے‘ رشتے ناطے بڑے عزیز تھے‘ ان پر کوئی آنچ گوارا نہیں تھی‘ جبکہ حق کی تلوار تو رشتے کاٹ رہی تھی‘ باپ بیٹے سے‘ بھائی بھائی سے جدا ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے جب وہ اس جِدّوجُہد کے خلاف کوشش کرتے تھے تو مؤمنین صادقین ان سے کہتے تھے کہ مت فساد مچاؤ زمین میں!

غور کیجیے‘ یہ فساد کون سا ہے؟ وہ فساد یہ ہے کہ اصلاح فی الارض کی جو کوشش ہو رہی ہے اس کو سبوتاژ نہ کرو۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دو جس طریقے سے مؤمنین صادقین ساتھ دے رہے ہیں۔ جب تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم توحید کو بھی مانتے ہیں‘ آخرت کو بھی مانتے ہیں‘ اور تورات کو بھی مانتے ہیں جس کی تصدیق کرتے ہوئے یہ قرآن آیا ہے‘ تو پھر اس کو بھی مانو۔ حضور ﷺ کی پکار ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ﴾ (آل عمران:۵۲ والصف:۱۴) پر سب کے سب ان کے مددگار اور دست و بازو بنو‘ تاکہ اللہ کے خلاف زمین میں جو بغاوت ہے یہ فرو ہو اور اللہ کا نظام‘ اللہ کی حکومت قائم ہو۔ ’’حق بحقدار رسید‘‘ کے مصداق حق دار کو اُس کا حق ملے‘ اصل امن تب ہو گا۔ البتہ منافقین اور یہود دونوں کی روش محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنا تھی۔ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ کی جِدّوجُہد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کو قرآن نے فساد فی الارض کہا ہے۔ وہ جواب میں کہتے تھے کہ ہم تو مصلح ہیں‘ ہم تو چاہتے ہیں یہ لڑائی بھڑائی نہیں ہونی چاہیے‘ خواہ مخواہ کی خون ریزی نہیں ہونی چاہیے‘ بلکہ رواداری ہونی چاہیے۔

بات ذرا میٹھے انداز میں کی جانی چاہیے‘ بجائے اس کے کہ تلخ انداز اختیار کیا جائے۔ کٹ جانے کی بجائے مصالحت کی روِش اختیار کرنی چاہیے۔مکی دَور میں یہ کردار ولید بن مغیرہ کا تھااور مدینہ آ کر یہی رویہ یہود کا‘ پھر منافقین کا ہوگیا۔

چنانچہ یہاں فرمایا:﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾’’جب ان سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد مت مچاؤ!‘‘ یعنی اللہ کے رسول ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کے دست و بازو بنو‘ان کا ساتھ دو ﴿قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ’’وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔‘‘ ہم تو چاہتے ہیں کہ بھائی چارے کی فضا قائم رہے‘ تصادم نہ ہو‘ کشاکش نہ ہو‘ خون ریزی نہ ہو۔ یہ خوامخواہ کا ایک دوسرے سے کٹ جانا اچھا نہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا:﴿اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ‘ حقیقت میں یہی فساد پھیلانے والے ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔‘‘ اس وضاحت کی روشنی میں فساد اور امن کی تعریف (definition) اگر سامنے ہو تو ان آیات کا ایک ایک لفظ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ انہیں پتہ نہیں‘ حقیقت ان کے سامنے واضح نہیں‘ یہ short sighted ہیں۔ یہ جو اس وقت دیکھ رہے ہیں کہ کوئی مصیبت نہ آ جائے‘ جھگڑا نہ ہو‘ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہ ہو جائیں‘ ایک دوسرے سے کٹ نہ جائیں‘ بلکہ صلح کُل اور رواداری کے انداز میں اس معاشرے کے اندر ہم مل جل کر رہیں‘ حقیقت میں یہ فساد ہے۔ اس لیے کہ جو جدّ و جُہد فساد کو رفع کرنے کی ہو رہی ہے اس کا ساتھ دینا ضروری ہے‘ لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اٰمِنُوۡا کَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَہَآءُ ؕ﴾ ’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں‘ وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟‘‘

یہاں ’’النَّاس‘‘ لام معرفہ کے ساتھ ہے‘ اس سے اہلِ ایمان کی طرف اشارہ ہے کہ جیسے دوسرے لوگ ایمان لا رہے ہیں۔ دیکھو ان تمام مہاجرین کو جو اللہ اور اُس کے

رسول ﷺ کی وفاداری میں گھر بار چھوڑ کر آ گئے ہیں اور دیگر اوس و خزرج کے اہلِ ایمان کو جنہوں نے ہمہ تن حضرت محمد ﷺ کی اطاعت قبول کی ہے۔ اپنا سب کچھ حضور ﷺ کی سپردگی میں دے دیا ہے۔’’مواخات‘‘ کے طور پر مہاجرین میں اپنے گھر اور دکانیں تقسیم کر دیے ہیں۔تو فرمایا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے جیسے یہ لوگ ایمان لائے ہیں ویسے ہی ایمان لاؤ!اب اس میں بھی دونوں طرف بات چلے گی۔

یہودِ مدینہ کا دعوائے ایمان

یہود کہتے تھے کہ جب ہم توحید اور آخرت کو مانتے ہیں تو ہم بھی مؤمن ہیں۔ ہم موسیٰ (علیہ السلام) اور تورات کو مانتے ہیں‘ تم محمد (ﷺ) اور قرآن کو مانتے ہو تو کیا فرق ہو گیا؟ اس اعتبار سے ہمیں بھی مؤمن تسلیم کرو‘ ہمیں recognize کرو۔ تاریخی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی حکمت یہ ظاہر ہوئی کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ فوری طور پر یہود کے کان کھڑے نہ ہو جائیں اور وہ پہلے دن ہی سے مخالفت پر کمر بستہ نہ ہو جائیں‘ بلکہ ان کے ذہن میں یہ بات آئے کہ ان کا اور ہمارا قبلہ ایک ہی ہے۔ بیت اللہ جو ان کا مقدس مقام ہے‘ ان کے جدِّ امجد حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی عمارت ہے‘ جس کے ساتھ ان کا نسلی و قومی اور مذہبی روایات کے اعتبارات سے بہت گہرا رشتہ ہے‘ اس کی طرف رخ کرنے کی بجائے مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کیا ہے‘ تو یہود کو ایک طرح سے کچھ اطمینان حاصل ہوا کہ یہ کوئی اتنے غیر بھی نہیں ہیں‘ ان سے اتنا زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو گویا ایک اعتبار سے ہمارے متبعین ہیں‘ ہمارے camp followers ہیں‘ ہمارے قبلے کی پیروی کر رہے ہیں۔ لہٰذا فوری طور پر یہود کی طرف سے کوئی مخالفت اور دشمنی ظاہر نہ ہوئی۔

حضورِ اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد فوری طور پر یہود کو جس طرح معاہدوں میں جکڑ لیا‘ یہ حضور ﷺ کی طرف سے ایک بہت حکیمانہ اقدام تھا۔ قبلے کا معاملہ بھی اللہ تعالیٰ کی

طرف سے اسی نوعیت کی حکمت کا اظہار ہے کہ بجائے اس کے کہ یہود فوری طور پر اہلِ ایمان کی بیخ کنی پر کمر کس لیں اور حضور ﷺ اور اہلِ ایمان کو مدینہ کے اندر اپنی پوزیشن کو مستحکم (consolidate) کرنے کا موقع ہی نہ ملے‘ تحویلِ قبلہ تک ۱۶ ماہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو ملے جس میں آپؐ نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کیا اور یہود کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ اس کے بعد پھر وہ سازشیں کرتے رہے۔ اوپر سے صلح‘ اندر سے سازش۔ جو شخص یہ رویہ اختیار کرتا ہے اس کی اپنی کوئی اخلاقی قوت (moral strength) باقی نہیں رہتی۔ وہ تو خود اپنے ضمیر کے سامنے مجرم ہوتا ہے کہ اوپر سے میں صلح کیے ہوئے ہوں اور بباطن سازش کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس کے وار میں کبھی زیادہ زور نہیں ہوگا۔ وہ جو کبھی جگر نے کہا تھا: ؎

مَیں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں‘ قاتل سے یہ کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں!

جس شخص کو یقین نہ ہو کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ حق ہے‘ اُس کے وار میں زور نہیں ہوتا۔ اس کا وار بھرپور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ وہ تو خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہے‘ اپنے ضمیر کا مجرم ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک بڑا حکیمانہ معاملہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ساتھ ان کے اس دعوے کی بڑی مطابقت تھی کہ ہم بھی مؤمن ہیں‘ ہمیں بھی تسلیم کرو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم محمد (ﷺ) پر ایمان لائیں اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیں۔ تم بھی مانتے ہو تورات اللہ کی کتاب ہے‘ وہ ہمارے پاس ہے۔ تم مانتے ہو کہ موسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے رسول ہیں‘ ہم ان کو مانتے ہیں۔ یہ پس منظر سامنے رکھیے۔ تو یہ جتنا بھی پورا بیانیہ (narrative) بیان ہو رہا ہے اس میں یہ دونوں بالکل فٹ بیٹھ رہے ہیں۔ کہیں پر کوئی بات یہود کے ساتھ زیادہ مناسب ہے‘ جیسے کہ پہلی آیت ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾﴾ اس کا زیادہ انطباق یہود پر ہوتا ہے کہ اس میں ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں۔ لیکن یہ جو طرزِ عمل بیان ہو رہا ہے کہ وہ جواب میں کہتے ہیں: ﴿اَنُؤۡمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَہَآءُ ؕ﴾ ’’کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بے وقوف لوگ ایمان لائے!‘‘ اس کا زیادہ انطباق منافقین پر ہوتا ہے۔

سَفِیۡہ اسے کہتے ہیں جسے اپنے بُرے بھلے کا فہم حاصل نہ ہو‘ ناسمجھ ہو۔ جیسے کہ سورۃ النساء میں آیا: ﴿وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَہَآءَ اَمۡوَالَکُمُ﴾ (آیت ۵) ’’اور اپنے مال ناسمجھوں کے سپرد مت کرو‘‘۔ اگر انہیں سمجھ نہیں ہے‘ نیک و بد کی تمیز نہیں ہے‘ اپنے نفع نقصان کا شعور نہیں ہے تو مال ان کے حوالے مت کرو۔ انگریز کے دور میں ’’کورٹ آف وارڈز‘‘ ایک محکمہ ہوتا تھا۔ کوئی بڑا جاگیردار یا زمین دار ہوتا‘ اس کی اولاد ناسمجھ ہوتی یا آوارہ ہوگئی ہوتی تو حکومت اس کی وراثت جبراً کورٹ آف وارڈز کے سپرد کر دیتی تھی کہ اس سے اولاد کا خرچہ ادا کیا جائے۔ وہ کھائیں پئیں‘ لیکن اس جائیداد پر ان کا کنٹرول نہ ہو‘ ورنہ وہ اسے اللّے تللّوں میں اڑا دیں گے۔ اسی طرح منافقین یہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو دیوانے ہیں‘ fanatics ہیں۔ انہیں اپنے نفع نقصان کا خیال نہیں‘ جان اور مال کی پروا نہیں۔ یہ تو جان ہتھیلیوں پر لیے پھر رہے ہیں‘ گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ اسی طرح جو یہاں انصار میں سے مؤمنین صادقین ہیں‘ انہیں بھی دائیں بائیں دیکھ کر‘ سوچ سمجھ کر‘ آگے پیچھے دیکھ کر چلنا چاہیے۔ اپنا بھی کوئی تحفظ ہو‘ جان و مال کا بھی خیال رہے۔ اولاد کے بھی حقوق ہیں‘ گھر والوں کا معاملہ ہے۔ آدمی یہ ساری چیزیں سوچ سمجھ کر چلے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر چیز سے بالکل آزاد ہیں۔ جب پکارا‘ حاضر ہو گئے۔ جس کام کے لیے کہا‘ سرِ تسلیم خم۔ ہم تو اتنے ناسمجھ نہیں ہیں۔ چلنا چاہتے ہیں لیکن دیکھ بھال کر‘ دائیں بائیں دیکھ کر‘ اپنے جان و مال کے تحفظ کے ساتھ۔ یہ بات منافقین کے کردار پر صد فی صد منطبق ہو رہی ہے کہ ان کے نزدیک ’’ہر چہ بادا باد‘ ما کشتی در آب انداختیم‘‘ کا معاملہ ایک حماقت ہے۔

سورۃ الحج کی آیت ۱۱ میں فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ ۚ﴾ یعنی لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی بندگی کنارے کنارے رہ کر کرنا چاہتے ہیں۔ منجدھار میں کودنا نہیں چاہتے۔ وہ آخرت بھی چاہتے ہیں لیکن دنیا کا گھاٹا بھی گوارا نہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہمیں دین بھی ملے لیکن دنیا کا بھی کوئی نقصان نہ ہو۔ جنت بھی مل جائے مگر دنیا میں کوئی قربانی بھی نہ دینی پڑے۔ اللہ کی بندگی تو کرنا چاہتے ہیں لیکن

کنارے کنارے‘ حفاظت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے۔ اپنے تحفظ کا خیال مقدم ہے۔ safcty first ۔فرمایا: ﴿فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨاطۡمَاَنَّ بِهٖ ۚ﴾ تو اگر خیر ہو‘ فائدہ حاصل ہو جائے‘ مالِ غنیمت بھی مل جائے‘ کچھ کرنا بھی نہ پڑے‘ (ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ آئے چوکھا) تو اس پر بڑے مطمئن ہوتے ہیں۔ ﴿وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانۡقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ ۚ﴾ اور اگر کہیں فتنہ و آزمائش‘ ابتلاء و امتحان‘ جان و مال کے لیے خطرات آ گئے تو اوندھے منہ گر پڑے۔ یہ ہے ایک کردار۔ فرمایا: ﴿خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ (11)﴾ ''وہ خسارے میں رہا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہی تو کھلا خسارہ ہے۔'' یہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ اور تباہی و بربادی ہے۔

﴿اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ (13)﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ یہی بیوقوف ہیں (یہی احمق ہیں‘ یہی ناسمجھ ہیں) لیکن انہیں علم نہیں ہے۔''

ایمان کے اعتبار سے اصل تجارت‘ سب سے زیادہ کامیاب تجارت تو وہ ہے کہ جان و مال اللہ کے حوالے کر دو۔ سورۃ التوبہ میں فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ (111)﴾

''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے اُن کی جانیں بھی اور اُن کے مال بھی‘ اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں‘ پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمّہ ہے سچا‘ تورات‘ انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اپنی اس بیع پر جس کا سودا تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی۔''

اگر یہ سودا کر لیا تو خوشیاں مناؤ۔ اگر ایمان کی رمق موجود ہو تو محسوس ہو گا کہ اس سے زیادہ

نفع بخش سودا کوئی اور نہیں ہے۔ اصل میں تو انہیں علمِ حقیقی حاصل نہیں اور یہ اس ایمانِ حقیقی سے بھی محروم ہیں‘ اس لیے سچے اہلِ ایمان کو کہہ رہے ہیں کہ احمق اور ناسمجھ ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا مَعَكُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ (14)﴾ ''اور جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں (یا ہم بھی ایمان لائے ہیں) اور جب یہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس‘ کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو محض مذاق کر رہے ہیں۔''

یہ دونوں ترجمے اس اعتبار سے کہ اگر یہود پر منطبق کریں تو ''ہم ایمان رکھتے ہیں'' یعنی ہم اللہ اور آخرت کو مانتے ہیں‘ رسولوں کو مانتے ہیں‘ ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں‘ موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں‘ تورات کو مانتے ہیں‘ ہم بھی مؤمن ہیں۔ یا یہ کہ منافقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''ہم ایمان لے آئے ہیں''‘ یعنی ہم محمد رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں‘ لیکن جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیے میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں یقیناً ہم آپ کے ساتھ ہی ہیں۔ ہماری طرف سے اپنے دل میں کوئی تشویش پیدا نہ ہونے دیں کہ ہم آپ کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ یہ تو بس ہنسی اور دل لگی ہے‘ یا جیسے ہم بامحاورہ کہتے ہیں کہ ہم ذرا مسلمانوں کو بنا رہے ہیں‘ اس بات کی اس سے زیادہ حقیقت نہیں ہے۔

اس ضمن میں سورۃ البقرہ کی آیات ۷۶‘۷۷ میں بھی ایک مضمون آ رہا ہے جس کے الفاظ اس سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ یہاں یہود کا تذکرہ ہے۔ دوسری اقوام کی طرح یہودی قوم اور گروہوں میں بھی مختلف مزاج کے لوگ ہیں‘ جیسا کہ سورۃ آلِ عمران میں آیا ہے کہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی حق پرستی کا کچھ نہ کچھ بھرم قائم رکھنا چاہتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی بات پر سختی سے اڑ گئے تھے‘ کسی بھی درجے میں کوئی معقول بات ماننے کو تیار نہیں تھے‘ چنانچہ ان میں یہ تمام shades تھے۔ مکہ میں حضور ﷺ کی بارہ برس کی دعوت کے ردِّعمل میں مختلف لوگ

سامنے آئے‘ سب کا کوئی ایک موقف نہیں تھا۔ اسی طرح یہود میں بھی مختلف مزاج‘ انداز اور موقف رکھنے والے لوگ تھے۔ ان میں سے کچھ کہتے تھے کہ ہاں جو کچھ نبی آخرالزماں (ﷺ) فرما رہے ہیں یہ حق ہے‘ جن باتوں کی آپ کے رسول (ﷺ) خبر دے رہے ہیں‘ یہ ہماری کتب میں بھی درج ہے۔ گویا کہ ایک طرح سے تائید تھی‘ کسی درجے میں اپنی حقیقت پسندی یا حق پسندی کا مظاہرہ کرتے تھے‘ لیکن صراحت کے ساتھ یہ کہنا کہ ہم محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے ہیں‘ اس سے گریز کرتے تھے۔ پھر جب یہ علیحدہ اپنی مجلسوں میں ہوتے تھے تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو! جو باتیں ہماری کتب میں درج ہیں وہ تم ان مسلمانوں کو بتا رہے ہو! یہ قیامت کے دن تم پر حُجت قائم کریں گے کہ اے اللہ! انہوں نے مانا اور تسلیم کیا تھا کہ یہ سب ہماری کتب میں درج ہے‘ اس کے باوجود محمد ﷺ پر ایمان نہیں لائے تھے۔ لہٰذا ہمیں یہ باتیں انہیں نہیں بتانی چاہئیں۔ یہاں وہ بات بیان کی جا رہی ہے:

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ لِيُحَآجُّوۡكُمۡ بِهٖ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾﴾

’’اور (ان میں سے کچھ لوگ ہیں کہ) جب ملتے ہیں اہلِ ایمان سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اور جب وہ خلوت میں ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ تو کہتے ہیں کیا تم بتا رہے ہو ان کو وہ باتیں جو اللہ نے کھولی ہیں تم پر؟ تاکہ وہ ان کے ذریعے تم پر حُجت قائم کریں تمہارے ربّ کے پاس! کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟ تو کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو تو معلوم ہے وہ سب کچھ بھی جو وہ چھپاتے ہیں اور وہ سب کچھ بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔‘‘

کیا ان احمقوں کو یہ بات یاد نہیں رہی یا ان کے علم میں نہیں ہے کہ اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے۔ خواہ یہ اسے چھپا بھی لیں‘ اللہ کی نگاہوں سے تو وہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ گویا یہ ان کی ناسمجھی کی دلیل ہے جس پر قرآن کریم نے ایک طرح کی تعریض کی ہے۔ یہ آیت

ثابت کر رہی ہے کہ یہ یہود کا آپسی معاملہ تھا‘ چنانچہ اس سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ بات بھی یہود ہی سے متعلق ہے۔

لفظ ’’شیطان‘‘ کی وضاحت اور علمائے یہود

متذکرہ بالا آیت ۷۶ میں ﴿وَاِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ﴾ کے الفاظ آئے ہیں کہ جب وہ ایک دوسرے سے خلوت میں ملتے ہیں‘ اور یہاں (آیت ۱۴ میں) آیا: ﴿وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ﴾ ’’جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیے میں ہوتے ہیں۔‘‘ یہاں لفظ ’’شیطان‘‘ پہلی مرتبہ آیا ہے‘ تو اُس کی کچھ وضاحت سمجھ لیجیے۔ ایک رائے یہ ہے اور امام راغب اصفہانیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ اس میں ’’ن‘‘ اصلی ہے۔ شَطَنَ ای تَبَعَّدَ: دُور ہو جانا۔ یعنی سرکشی اور معصیت کے اعتبار سے اللہ سے دُور ہو جانا‘ ہدایت سے دُور ہو جانا۔ الشیطان وہ ہے جو ہدایت سے بہت دُور ہو گیا‘ اللہ سے بہت دُور ہو گیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ شَاطَ یَشِیطُ سے فَعْلان کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ شَاطَ یَشِیطُ کے معنی ہیں: احترق غضبًا و حسدًا یعنی کوئی شخص غصے اور حسد کے اندر جل بھن کر کباب ہو جائے۔ اس سے پھر فعلان کے وزن پر ’’شیطان‘‘: غصے اور حسد کی آگ میں جل اُٹھنے والا‘ جل کر بھسم ہونے والا۔ اس اعتبار سے امام راغبؒ نے حضور ﷺ کی ایک حدیث بھی نقل کی ہے: ((اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَ الْغَضَبُ شَیْطَانٌ)) (مفردات القرآن: ۱/۵۶۸) یعنی حسد اور غضب ہی اصل شیطنت کی بنیاد ہیں۔ شیطنت انہی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ یہاں مراد ہے جو اُن کے بڑے سردار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد علمائے یہود تھے۔ اس لیے کہ اوس اور خزرج کے بڑے بڑے سردار تو ایمان لے آئے تھے‘ سوائے عبد اللہ بن اُبی خزرجی کے‘ جو منافقین کا سردار تھا۔ تو ’’شیاطین‘‘ کا اطلاق بھی دونوں طرف ہوگا۔

اہلِ کتاب میں سے بھی کچھ سردار ایسے تھے کہ جو کہتے تھے ہم بھی مؤمن ہیں‘ ہم توحید و آخرت کو مانتے ہیں‘ ہم بھی ایمان لائے‘ لیکن انہیں خطرہ تھا کہ ہماری سرداری‘ سیادت‘ چودھراہٹ اور مسندیں خطرے میں ہیں‘ لہٰذا جا کر اپنے لوگوں کو مطمئن کرتے

تھے کہ گھبرائیں نہیں‘ ہمارے بارے میں آپ کو کوئی سوئے ظن نہ ہو۔ ہم آپ کے ساتھی ہیں لیکن ان مسلمانوں کے ساتھ ذرا استہزاء کر رہے تھے۔ ان کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

اسی طرح منافقین کا معاملہ تھا‘ اور منافق تو ہے ہی وہ جو دوطرفہ رہنا چاہتا ہے: ﴿مُذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ﴾ وہ یکسو تو ہونا چاہتا ہی نہیں۔ اگر وہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہو جائے تو اسے کفار کے ساتھ تعلق توڑنا پڑے گا جس کے لیے وہ تیار نہیں۔ اگر وہ کفار کے ساتھ ہو جائے تو اہلِ ایمان سے تعلق ٹوٹتا ہے۔ چنانچہ ان کی روش یہ تھی کہ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو! دیکھو‘ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کو انگریزی میں کہتے ہیں: Don't put all your eggs in one basket کہ اپنے سارے انڈے ایک ٹوکری میں نہ رکھو‘ اگر وہ کہیں گر گئی تو سارے کے سارے انڈے ٹوٹ جائیں گے۔ چنانچہ عقل کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ تقسیم کر کے رکھو۔ اہلِ ایمان کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھو اور کفار کے ساتھ بھی۔ سورۃ المجادلہ میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ مَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلَا مِنۡهُمۡ ۙ وَيَحۡلِفُوۡنَ عَلَى الۡكَذِبِ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۴﴾

’’کیا تم نے غور نہیں کیا اُن لوگوں (کے طرزِ عمل) پر جنہوں نے دوستی گانٹھی ہے اُن لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ اُن میں سے ہیں‘ اور وہ جانتے بوجھتے جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔‘‘

یہ جھوٹا حلف لے رہے ہیں‘ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اے مسلمانو! یہ نہ تم میں سے ہیں نہ یہود میں سے‘ اگرچہ انہوں نے یہود کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا ہے‘ انہیں بھی اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہے‘ لیکن حقیقت میں یہ ان کے بھی نہیں ہیں۔ نہ یہ ان کے ہیں نہ تمہارے ہیں۔ یہ آیت بھی دونوں پر منطبق ہوتی ہے‘ یعنی یہود پر بھی اور منافقین پر بھی۔

آیت ۱۵ ﴿اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَيَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝۱۵﴾

’’درحقیقت اللہ اُن کا مذاق اڑا رہا ہے اور اُن کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ اپنے عقل کے اندھے پن میں بڑھتے چلے جائیں۔‘‘

عقل کے اندھے: خود پسندی کا شکار

درحقیقت اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ یہ گویا صورت حال کی تعبیر ہے‘ وگرنہ اللہ کے لیے استہزاء کا لفظ موزوں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے ہاتھوں خود اپنا مذاق بنوا رہے ہیں‘ قدرت ان کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ حقیقت بین نگاہ دیکھ رہی ہے کہ یہ کس طرح اپنے جال میں خود پھنستے جا رہے ہیں‘ اپنی عاقبت کو کس طرح برباد کر رہے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ’’استہزاء‘‘ یہ ہے کہ وہ ان کی رسّی دراز کر رہا ہے‘ انہیں ڈھیل دے رہا ہے‘ جسے ’’استدراج‘‘ کہتے ہیں۔

﴿وَيَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝۱۵﴾۔ مَدّ یَمُدُّ مَدَدًا: مدد دینا‘ نصرت کرنا۔ اگر کسی کو مدد دی جائے تو وہ اس کے لیے سہارا بن جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے گر پڑا تھا‘ چل نہیں پا رہا تھا تو تعاون یا مدد کی وجہ سے چل پڑتا ہے۔ جب کہ مَدَّ یَمُدُّ مَدًّا کے معنی کھینچنا‘ کسی کو آگے لے جانا‘ ڈھیل دینا‘ رسّی دراز کرنا ہے۔ طَغٰی سرکشی کے معنی میں آتا ہے۔ کسی کا اپنی حد سے گزر جانا طغیانی ہے۔ بقول حالی: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

جب دریا اپنی حدود کے اندر چل رہا ہو تو یہ اس کی معمول کی کیفیت ہے اور جب وہ اپنی حدود سے تجاوز کر گیا تو یہ طغیانی ہے۔

’’یَعۡمَهُوۡنَ‘‘ کا لفظ بھی بہت اہم ہے۔ اس کا مادّہ ع م ہ ہے۔ ع م ی (عمی) کا مادہ انسان کے نابینا اور اندھا ہونے کے لیے آتا ہے یعنی اس کی ظاہری قوتِ بصارت موجود نہیں‘ آنکھوں میں نور اور بینائی نہیں۔ یہ لفظ (عُمۡیٌ) آگے آئے گا کہ وہ لوگ جو اندھے ہیں۔ یہ ہے بصارتِ ظاہری‘ آنکھوں سے کسی شے کا دیکھنا‘ جب کہ ایک ہے بصیرتِ باطنی‘ دل سے کسی شے کی حقیقت کا ادراک اور شعور۔ بقول علامہ اقبال ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے‘ وہ نظر کیا!

جس شخص کی آنکھوں کی بینائی زائل ہوگئی وہ اَعْمٰی ہے‘ اس کی جمع عُمْیٌ ہے اور جن کی باطنی بصیرت زائل ہوگئی ہے ان کے بارے میں فرمایا: ’’یَعْمَھُوْنَ‘‘ کہ یہ داخلی اور باطنی بصیرت سے محروم ہوکر بھٹکتے چلے جا رہے ہیں۔

نوٹ کیجیے کہ اس رکوع میں دو مرتبہ ’’لَا یَشْعُرُوْنَ‘‘ اور ایک مرتبہ ’’لَا یَعْلَمُوْنَ‘‘ آچکا ہے۔ سورۃ المنافقون میں ’’لَا یَفْقَھُوْنَ‘‘ دو مرتبہ آیا ہے۔ درحقیقت لَا یَشْعُرُوْنَ‘ لَا یَفْقَھُوْنَ اور لَا یَعْلَمُوْنَ کو جمع کر دیجیے تو یہ ’’یَعْمَھُوْنَ‘‘ ہے۔ کوئی شخص ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے‘ اس کو نظر نہیں آ رہا ہے‘ اسے شعور و ادراک نہیں ہے‘ منزل کی خبر نہیں ہے۔ بقولِ غالب ؎ ’’نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!‘‘ اس کیفیت میں انسان چلا جا رہا ہے‘ بڑھا جا رہا ہے‘ یہ ’’یَعْمَھُوْنَ‘‘ ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ’’اور انہیں ان کی سرکشی میں ایسی ڈھیل دیتا ہے کہ وہ عقل کے اندھے پن میں بھٹکتے پھریں۔‘‘ اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیل دے رہا ہے‘ ان کی رسّی دراز کر رہا ہے‘ فوراً پکڑ نہیں رہا اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری چال کامیاب ہو رہی ہے۔

آیت ۱۶ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی ۪﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید لی ہے‘‘

عربی زبان میں ’’بیع‘‘ کا لفظ بیچنے کے لیے آتا ہے۔ بیع و شراء: بیچنا اور خریدنا۔ البتہ شراء دونوں معنی دیتا ہے۔ شَرٰی یَشْرِیْ شِرَاءً: خریدنا‘ بیچنا۔ بابِ افتعال میں اِشْتَرٰی یَشْتَرِیْ: خریدنا۔ یہ خریدنا اور بیچنا اصل میں تو مبادلہ ہوتا ہے‘ جیسا کہ پہلے زمانے میں کرنسی کا رواج نہیں تھا تو ساری تجارت مبادلہ (barter) کی تھی۔ کسی نے کھیت میں فصل اُگائی‘ محنت کر کے اناج اُگایا‘ کسی نے کرگے پر بیٹھ کر کپڑا بُنا۔ پس وہ ضرورت کے تحت exchange کر لیتے تھے۔ اب کس کو قیمت کہیں گے اور کس کو جنس یا مال (commodiy)؟ یہ جو بیچ میں کرنسی آئی ہے تو اس سے ایک مفہوم معیّن ہوا ہے کہ جس نے کرنسی دی ہے وہ خریدار ہے اور جس نے بدلے میں کوئی مال دیا ہے وہ بیچنے

والا ہے۔ قرآن حکیم میں شَرٰی یَشْرِیْ بیچنے اور اِشْتَرٰی یَشْتَرِیْ خریدنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۶ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے جو بیچ دیتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا کے لیے۔‘‘ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی جان اللہ کی رضاجوئی کے لیے بیچتے ہیں‘ جسم و جان میں جو توانائیاں اور صلاحیتیں ہیں انہیں اللہ کی رضا کے لیے صَرف کرتے ہیں۔ دوسری طرف سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ﴾ ’’یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے اُن کی جانیں بھی اور اُن کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے۔‘‘ تو معلوم ہوا کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیع و شراء کا معاملہ ہے۔

ایسے الفاظ قرآن کریم اس لیے لاتا ہے کہ یہ انسانی ذہن سے بہت قریب ہیں‘ عام انسان بھی ان کو سمجھتا ہے۔ کہیں تجارت کا لفظ آیا ہے‘ جیسا کہ یہاں بھی آ رہا ہے: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾﴾ اسی طرح سورۃ الصّف میں ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾﴾ ’’اے ایمان کے دعوے دارو! کیا مَیں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟‘‘ چنانچہ یہ بہت ہی بنیادی concepts ہیں جن کو ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی بھاری بھرکم فلسفیانہ اصطلاحات سامنے لائی جائیں یا منطق کی گتھیاں سلجھائی جائیں‘ قرآن مجید نے اپنا انداز بڑا فطری اور سادہ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت وضلالت

فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید لی ہے۔‘‘ عام طور پر تصور یہ ہے کہ ایک طرف گمراہی ہے اور ایک طرف ہدایت ہے اور انہوں نے ہدایت کے بجائے گمراہی کو پسند (choice) کر لیا ہے‘ حالانکہ اس پر تو بیع و شراء کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مبادلہ تو تب ہوگا کہ کوئی شے دے

کر کوئی شے لی جائے۔ اسی لیے مَیں بار بار ترجمہ کر رہا ہوں کہ انہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خرید لی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہدایت پہلے سے ان کے پاس موجود تھی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کو مَیں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ واقعتاً ہدایت حاصل ہو جاتی ہے‘ پھر انسان اپنے تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر‘ یا اپنی حیثیت‘ وجاہت اور اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اس کو ردّ کر کے گمراہی خریدتا ہے۔ قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی حق بات انسان کے سامنے آئے اور دل گواہی دے دے کہ یہ حق ہے تو اس کو قبول کرنے اور اس کا اعتراف کرنے میں عافیت ہے‘ لیکن اگر انسان حق کو پہچاننے کے بعد اس کو تعصب‘ مصلحت یا کسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ردّ کرتا ہے تو گویا اس نے جان بوجھ کر خود کو ہدایت سے محروم کیا ہے۔ یہی طرزِ عمل آگے بڑھ کر اس کو point of no return تک لے جاتا ہے۔ پھر اس میں حق کو پہچاننے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی‘ استعداد ہی سلب ہو جاتی ہے۔ یہ بات قرآن کی نص سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ سورۃ المنافقون میں منافقین کے بارے میں فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳﴾

’’یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے‘ تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی‘ پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔‘‘

ایمان انہیں مل چکا تھا‘ ہدایت ان کے پاس آ گئی تھی‘ دل میں بات اُتر گئی تھی‘ حق ان پر منکشف ہو چکا تھا‘ دل نے اسے قبول کر لیا تھا‘ اس سب کے باوجود انہوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی‘ اب وہ تفقہ سے خالی ہو چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت وضلالت قرآن میں بار بار آتا ہے اور اس میں انسان اگر ذرا سا بھی ان دونوں پہلوؤں کو سامنے نہ رکھے تو اشکالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جب اللہ نے مہر کر دی تو وہ کیسے سمجھ سکتے تھے؟ اللہ ابتداءً مہر نہیں کرتا‘ بلکہ جب انسان حق کو پہچاننے کے بعد اسے ردّ کرتا ہے تو یہ اس کی سزا کے طور پر ہوتا ہے‘ اور وہ بھی ایک دم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً ہوتا ہے۔ جب آدمی اس پر اَڑتا‘ اصرار کرتا اور اسی پر اپنے

طرزِ عمل کو مسلسل قائم رکھتا ہے تو پھر تدریجاً اُس سے حق کو پہچاننے کی استعداد سلب ہو جاتی ہے‘ جس کا آخری درجہ یہ ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾

’’اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر‘ اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پردہ پڑ چکا ہے‘ اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔‘‘

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶﴾ ’’سو نافع نہ ہوئی ان کی تجارت ان کے حق میں اور نہ ہوئے وہ راہ پانے والے۔‘‘

عربی زبان میں جن الفاظ کے سہ حرفی مادے قریب ہوتے ہیں ان کے مفہوم میں بھی قرب ہوتا ہے۔ رَبِحَ یَرْبَحُ (س) رِبْحًا کے معنی ہیں (تجارت میں) نفع ہونا‘ بڑھوتری ہونا‘ کسی چیز میں اضافہ ہونا‘ منفعت بخش ہونا۔ جب کہ ’’ر ب و‘‘ مادہ سے رَبَا یَرْبُوْ رِبَاءً کے معنی ہیں (مال کا) زیادہ ہونا‘ بڑھنا‘ نشوونما پانا‘ نفع ہو جانا۔ اگرچہ ’’رِبَا‘‘ خاص طور پر مختص ہو گیا ہے اُس حرام شے کے لیے جو اضافہ حرام ذریعہ سے ہو رہا ہے۔ رِبَا (سود) حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والا ہے جبکہ جائز طریقے سے تجارت میں نفع حلال ہے: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۷۵) ’’اللہ نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام ٹھہرایا ہے۔‘‘ ناجائز طریقے سے اگر اضافہ ہوا ہے تو وہ ربا ہے اور اگر تجارت کے ذریعہ سے اضافہ ہوا ہے تو یہ ربح ہے۔ ر ب ح اور ر ب و مادہ کے لحاظ سے بھی بہت قریب بھی ہیں اور اصولی اعتبار سے مفہوم میں بھی بہت قرب ہے‘ اگرچہ اصطلاح کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہاں تلاوت کی گئی ۹ آیات (۸ تا ۱۶) مکمل ہو گئی ہیں۔

(جاری ہے)

معیارات کا تضاد: باعثِ فساد

شجاع الدین شیخ، امیر تنظیم اسلامی

مسجد جامع القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور میں ۲ جنوری ۲۰۲۶ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

قرآنِ حکیم کے آخری پارے میں اکثر سورتیں مکی ہی ہیں، جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنیادی مضمون فکرِ آخرت کے اعتبار سے عطا فرمایا۔ ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی صفات کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ اس وقت سورۃ المطففین سے پہلی چھ آیات تلاوت کی گئی ہیں۔ ان میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی مذمت کرنے کے ساتھ وہ وجہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ انسان یہ گھٹیا حرکت کرتا کیوں ہے! ناپ تول کی کمی سے مراد صرف ترازو سے تولا جانا ہی نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ اخلاقی رویوں میں بھی ہوا کرتا ہے۔ باہمی معاملات اور تعلقات میں بھی ہوا کرتا ہے۔ یہ گھروں میں بھی ہوتا ہے اور اداروں میں بھی۔ یہ عوام اور حکمرانوں کے درمیان بھی ہو جایا کرتا ہے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ایسا بندے اور رب کے درمیان میں بھی ہو جایا کرتا ہے۔ ناپ تول کا تصور بڑا وسیع ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قوموں کے حالات کا جو ذکر کیا ہے، وہ محض حالات سے باخبر کرنے یا تاریخ سے آگاہی دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد ہدایت، رہنمائی اور عبرت دینا ہے۔ انہی اقوامِ عالم کے واقعات میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اصحابِ مدین کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس قوم میں شرک کی برائی کے ساتھ معاشی معاملات میں ناپ تول کی کمی کا جرم بھی موجود تھا۔ اس قوم پر عذاب بھی آیا اور شعلے بھی برسائے گئے۔ زوردار چیخ یا آواز کا عذاب بھی مسلط کیا گیا۔ زلزلہ بھی اس قوم پر آیا۔ ان کے دو بڑے جرائم تھے: شرک کا معاملہ اور معاشی معاملات میں ناپ تول کی کمی کا مسئلہ۔ فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱﴾

’’ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔‘‘

﴿الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲﴾

’’وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔‘‘

﴿وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳﴾

’’اور جب خود انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔‘‘

﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴﴾

’’کیا اُن کو یہ گمان نہیں کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں!‘‘

﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵﴾

’’ایک بڑے دن کے لیے۔‘‘

﴿يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶﴾

’’جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے ربّ کے سامنے۔‘‘

اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔ اے اللہ ہم سب کے حساب کو آسان فرما دے!

اس سورت کی پہلی ہی آیت میں ’’وَیْل‘‘ کا لفظ ہے، جو ہم قرآن حکیم کی آخری سورتوں میں بھی پڑھتے ہیں:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝۱﴾ (الھمزۃ)

’’بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چنتا اور طعنے دیتا رہتا ہے۔‘‘

اسی طرح:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴﴾ (الماعون)

’’تو بربادی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے۔‘‘

’’وَیْل‘‘ کا لفظ قرآن پاک میں جابجا آیا ہے۔ اس کا ترجمہ تباہی بھی ہے، بربادی بھی ہے، ہلاکت بھی ہے۔ بعض روایات کی روشنی میں یہ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے۔ پھر مزید وضاحت یہ کی گئی کہ جہنم کی اس وادی کا عذاب اتنا سخت ہے کہ خود جہنم بھی اس سے پناہ مانگتی ہے۔ یعنی عذاب کے اعتبار سے بڑا سخت مقام ہے۔ اصل تباہی، بربادی اور ہلاکت بہرحال آخرت میں ہے۔ یہاں پر ناپ تول کی کمی کرنے والوں کے لیے ’وَیْل‘‘ کا ڈراوا آیا ہے۔

سورۃ الھمزۃ میں یہ وعید رودررو طعنہ زنی کرنے والوں‘ مذاق اُڑانے والوں‘ پیچھے بیٹھ کر برائیاں کرنے والوں‘ اورغیبت کرنے والوں کے لیے آئی ہے۔ سورۃ الماعون میں فرمایا گیا:

﴿فَوَيۡلٞ لِّلۡمُصَلِّينَ ۝٤ ٱلَّذِينَ هُمۡ عَن صَلَاتِهِمۡ سَاهُونَ ۝٥﴾

’’تو بربادی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے‘ جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔‘‘

قرآن حکیم میں اور رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات میں ایمانیات اور عقائد کے ساتھ معاملات‘ رویّوں اور کردار کا بیان بھی ہے۔ اللہ کا یہ دین ہمارے عقائد کے ساتھ ہمارے اعمال‘ معاملات‘ رویوں اور کردار کو بھی درست کرنا چاہتا ہے۔ جن چھ آیات کا ابھی مطالعہ کر رہے ہیں ان میں آخرت کا ذکر بھی آیا ہے‘ اللہ کے سامنے پیشی کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کے لیے تباہی بیان کی جا رہی ہے جو ناپ تول کی کمی کرنے والے ہوں۔ یہ نکتہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ مفسرین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ آج بھی مناظروں اور مباحث میں سارا زور عقائد کی چند ضمنی تفصیلات کے بیان تک محدود ہو گیا ہے۔ عقیدہ اگر درست ہو تو اس کا عکس کردار میں بھی نظر آئے گا۔ ایمان اگر مضبوط ہو گا تو کردار اس کی گواہی دے گا۔ کیا آج ہمارے مجموعی کردار‘ اعمال‘ رویے‘ معاملات یہ گواہی دے رہے ہیں کہ ہمارے عقیدے مضبوط ہیں؟ ایمان ہمارا مضبوط ہے؟ اس بات پر بھی توجہ کرنے اور توجہ کرانے کی ضرورت ہے۔ فرمایا:

﴿وَيۡلٞ لِّلۡمُطَفِّفِينَ ۝١﴾

’’ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔‘‘

تباہی ہے‘ بربادی ہے تَطْفِیف کرنے والوں کے لیے‘ کمی کرنے والوں کے لیے۔ طف کہتے ہیں بڑی حقیر سی شے کو۔ ناپ تول میں جو بندہ کمی کر رہا ہے‘ ڈنڈی مار رہا ہے بڑا حقیر سا فائدہ اس کے ہاتھ آ رہا ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا۔ دوسرے‘ تطفیف سے مراد ہے کمی کر دینا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ بدترین چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے۔ عرض کی گئی: حضور ﷺ! نماز میں چوری کیا ہوگی؟ فرمایا: رکوع صحیح ادا نہ کرنا‘ سجدے کو صحیح ادا نہ کرنا‘ نماز کو حسین بنانے کی کوشش نہ کرنا‘ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے ادا نہ کرنا اور جلد بازی کرنا‘ نماز کی چوری ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ ایک شخص نماز میں جلدی جلدی رکوع وسجود ادا کر رہا تھا تو فرمایا: ’’تُو نے تطفیف کر دی۔‘‘ اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کے سامنے کھڑے ہو‘ اس

کے آگے جھکو تو احسن طریقے پر۔ ہر نماز کے بعد ہم دعا کرتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ ’’اے اللہ! میری مدد فرما اپنے ذکر کے لیے اور اپنے شکر کے لیے اور اپنی عمدہ عبادت کے لیے۔‘‘ یہ جو عبادت مطلوب ہے حسن کے ساتھ‘ یہ صرف نماز ہی میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ پوری زندگی میں ایسا رویہ مطلوب ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنی ہے‘ روزہ رکھنا ہے‘ حج ادا کرنا ہے‘ قربانی پیش کرنی ہے‘ ماں باپ کے ساتھ رویہ ہے‘ کمائی کا معاملہ ہے تو ہر موقع پر حسین انداز میں بندہ بننا ہے۔ یہ ترازو کے دو پلڑوں میں تولے جانے والے امور ہی سے متعلق معاملہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ تباہی ہے‘ ہلاکت ہے‘ بربادی ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔ یہ لوگ کون ہیں؟

﴿ٱلَّذِينَ إِذَا ٱكۡتَالُواْ عَلَى ٱلنَّاسِ يَسۡتَوۡفُونَ ۝٢﴾

’’وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔‘‘

کوئی پیمانہ ہو گا‘ کوئی باٹ رکھا جائے گا یا موجودہ دور کا الیکٹرانک سکیل ہو گا‘ تو جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے تو پورا پورا ناپ کر لیتے ہیں لیکن:

﴿وَإِذَا كَالُوهُمۡ أَو وَّزَنُوهُمۡ يُخۡسِرُونَ ۝٣﴾

’’اور جب خود انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔‘‘

جب ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں۔ جو بھی پیمائش یا وزن کے پیمانے ہوں‘ جب لینے کی بات آتی ہے تو پورا پورا بلکہ زیادہ ہی لینے کی کوشش کرتے ہیں اور جب دینے کی بات آتی ہے تو ڈنڈی مارتے ہیں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اپنے لیے معیار کچھ اور ہے جبکہ دوسرے کے لیے کچھ اور۔ اپنے مفاد کی فکر ہے‘ دوسرے کا نقصان ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ یہ دراصل کردار اور رویے میں گراوٹ ہے جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہاں پر بیان کر رہا ہے۔ رسولِ مکرم ﷺ کی مشہور حدیث مبارک ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (صحیح البخاري)

’’تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ نہ چاہے جو اپنے آپ کے لیے چاہتا ہے۔‘‘

ہم سب کو چاہیے کہ جو اپنے لیے پسند کریں وہی دوسرے کے لیے بھی چاہیں‘ مگر اکثر ایسا

نہیں ہوتا۔ ہمارے جھگڑوں کی پچاس فی صد وجہ یہی ہے کہ اپنے لیے معیار کچھ ہے‘ دوسرے کے لیے کچھ اور۔ کاروبار اور اداروں سے شروع کر لیجیے تو ایک آجر ہے‘ اعلیٰ افسر ہے‘ مالک ہے‘ سیٹھ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میرا سارا اسٹاف جان لگا کر کام کرے‘ انتھک محنت کرے‘ وقت پر کام کرے اور رپورٹ بھی بروقت آئے۔ اہداف بھی پورے ہوں۔ البتہ جب تنخواہ دینے کی بات آتی ہے تو کہیں دو دن کے بعد‘ کہیں پانچ دن کے بعد‘ کہیں دس دن کے بعد‘ کارپوریٹ سیکٹر میں دو مہینے کے بعد‘ میڈیا ہاؤسز میں چار مہینے کے بعد ادائیگی ہوتی ہے۔ سیٹھ کہتا ہے کہ نقصان ہو گیا۔ نقصان وہ اسے کہتا ہے کہ اس نے سوچا تھا ایک کروڑ کا پرافٹ ہو گا لیکن پرافٹ ہو گیا ۸۰ لاکھ کا۔ اس بنیاد پر وہ تنخواہ دیر سے دے رہا ہے۔ پھر ایک کم سے کم اجرت کا معاملہ بھی ہے۔ اچھے بھلے مستحکم کاروبار ہیں اور ایک کوالیفائیڈ گریجویٹ کو تیس ہزار روپے دے رہے ہیں‘ وہ بھی اس کی آزمائشی مدت پوری ہونے کے بعد۔ اس چیز کو مَیں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اگر منافع ایک کروڑ سے ۸۰ لاکھ پر آ گیا تو کہتے ہیں نقصان ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ! چنانچہ ایک آجر کو اپنے لیے تو یہ پسند ہے کہ سٹاف وقت پر آفس میں ہو‘ وقت پر آفس سے جائے‘ زیادہ نہ بیٹھے کہ اوور ٹائم دینا پڑے البتہ ٹارگٹس بھی پورے کرے‘ رپورٹ بھی ٹائم پر دے‘ لیکن جب دینے کی باری آئے تو کم سے کم اجرت کا بھی خیال نہ کرے۔ اسے کہتے ہیں لینا پورا جبکہ دینا کم۔

اب اس معاملے کی معکوس صورت دیکھیں۔ ملازمین یہ چاہتے ہیں کہ بغیر محنت کے تنخواہ مل جائے۔ پہلی کو نہیں بلکہ مہینے کے آخری دن ہی میرے اکاؤنٹ کے اندر کریڈٹ ہو جائے۔ اس حدیث کا حوالہ دینا بھی نہیں بھولتے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے‘ تو پہلے مزدوری بھی تو کرو۔ دفتر میں بیٹھ کر سمارٹ فون بھی چل رہا ہے‘ کرکٹ کے میچز بھی چل رہے ہیں‘ گپیں بھی چل رہی ہیں۔ جو چیز امانت کے طور پر دفتر میں استعمال کے لیے دی گئی تھی وہ ذاتی کام میں لائی جا رہی ہے۔ سارا وقت اس طرح برباد ہو گا تو رپورٹ وقت پر خاک بنے گی‘ ٹارگٹس خاک پورے ہوں گے۔ تنخواہ وقت پر چاہیے لیکن کام میں گڑبڑ ہے۔

اسی طرح ہماری بیٹی بہو بن کر کسی کے گھر جائے تو ہم چاہتے ہیں کہ رانی بن کر رہے۔ اس کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے۔ اس کے برعکس کسی کی بیٹی کو ہم اپنی بہو بنا کر گھر لا رہے ہوں تو وہ

نوکرانی بن جاتی ہے۔ یہ تو بنیادی انسانی شرافت کے خلاف ہے۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے اُمتی اور ماننے والے ہیں۔ ہمیں بچپن سے یہ حدیث یاد ہے کہ ’’تم مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ دوسرے بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔‘‘

اسی طرح حکمرانوں اور عوام کے درمیان بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ عوام پورا ٹیکس دیں۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ تنخواہ دار طبقے پر ٹیکس کا کتنا بوجھ ہونا چاہیے‘ تاہم اہم سوال یہ ہے کہ اس ٹیکس کے عوض عوام کو کیا دیا جا رہا ہے! آپ کا‘ میرا جمع شدہ ٹیکس جو قوم پر خرچ ہونا چاہیے‘ وہ تو حکومت کی کرپشن کی نذر ہو گیا۔ حکمران دو چار فتوے بھی لے لیں گے کہ ٹیکس ادا کرنا شہریوں کی ذمہ داری ہے۔ گویا اپنے حصے کا فتویٰ لیتے ہیں۔ اپنی ذمہ داری کے بارے میں فتویٰ کیوں نہیں لیتے؟

ایک مثال اور لے لیں۔ ہم کبھی نہیں چاہتے کہ ہمارے گھر کے سامنے کوئی اپنی گاڑی اس طرح کھڑی کر دے کہ ہماری گاڑی نکل نہ سکے۔ اگر ہم اپنے گھر کے سامنے ایسا ہونا نہیں چاہتے تو اپنی گاڑی کسی دوسری جگہ پارک کرتے ہوئے کیا اس بات کا خیال رکھتے ہیں؟ جمعہ کا اجتماع ہے۔ دو افراد گاڑی کے درمیان میں فاصلہ اس لیے رکھتے ہیں تاکہ جو پہلے نکلنا چاہے وہ نکل جائے۔ ایسے میں ایک حضرت موٹر سائیکل پر آتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر کہتے ہیں: ماشاءاللہ‘ میں تو ایک نیک کام کرنے کے لیے آیا ہوں‘ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مجھے تو فوراً جگہ مل گئی۔ وہ اپنی موٹر سائیکل اس خالی جگہ کے اندر داخل کر دیتے ہیں۔ پھر ایک اور صاحب آتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ مسلمان مسلمان بھائی ہیں‘ سب نماز کو آئے ہوئے ہیں‘ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ پہلے والی موٹر سائیکل ذرا آگے ہٹا کر اپنی موٹر سائیکل بھی کھڑی کر دیتے ہیں۔ پھر مسجد سے اعلان کرانا پڑتا ہے کہ باہر گاڑی بلاک ہو گئی ہے۔ کسی کے گھر میں ایمرجنسی ہو گی‘ اس کو جانا ہے۔ اگر ایسی ہنگامی صورت حال ہمارے گھر میں ہوتی تو کیا ہمیں یہ اچھا لگتا؟

آج جنوری کی دو تاریخ ہے۔ ۳۱ دسمبر کی رات کو کراچی میں تو بہت کچھ ہوتا ہے‘ لاہور میں بھی ہوتا ہے۔ آتش بازی ہوتی ہے۔ یہ صرف جُہلاء یا غیر پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں کرتے بلکہ پوش ایریاز میں بھی ہوتی ہے۔ انتہائی بے ہودہ قسم کی بے ہنگم باتیں۔ کوئی اپنی رائفل صاف کر رہا ہے‘ کوئی ٹی ٹی صاف کر رہا ہے‘ کوئی اے کے ۴۷ ریپیٹر۔ رات کو ۱۲ بجے ہوائی فائرنگ

شروع ہو جاتی ہے۔ چاہے اس سے کسی بچے کے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے یا کوئی بزرگ متاثر ہو۔ صبح نماز کی فکر کس نے کرنی ہے! بے ہنگم فائرنگ شادی بیاہ کے موقع پر کرتے ہیں‘ نیو ایئر نائٹ کے موقع پر کرتے ہیں‘ پاکستان انڈیا کے میچ کے موقع پر کرتے ہیں۔ رمضان شریف کے اختتام پر جب شیطان کھل جاتا ہے تو ہم بھی کھل جاتے ہیں اور عید کی رات فائرنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کس قوم کی علامت ہوتی ہے! ایسے میں متعدد لوگ زخمی ہو جاتے ہیں‘ یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے‘ کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے‘ کسی کی گردن ٹیڑھی۔ اتنی بنیادی انسانی اخلاقیات ہم میں سے ختم ہو گئیں۔

یہ اللہ کا کلام ہے۔ یہ آپ کے‘ میرے گھروں میں آتا ہے۔ ہمارے اداروں میں آتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے رویوں میں اس کا نور نظر آئے۔ چنانچہ تباہی ہے ان کے لیے جو کمی کرتے ہیں۔ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا‘ مگر جب دینے کی بات آتی ہے تو اس میں ڈنڈی مارتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ پانچ مثالیں کافی ہیں۔ شارحین حدیث اور علمائے اُمت نے چند احادیث کو ایک بہت بڑا خزانہ قرار دیا کہ بہت سارے مسائل اور معاملات میں ان سے رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ ایک تو یہی مشہور حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ دوسرے کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اسی طرح بچپن سے ایک حدیث یاد ہے‘ جس میں مسلمان کی تعریف یہ بتائی گئی کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ))(متفق علیه)۔ کیا اس قسم کی فائرنگ سے دوسرے لوگ محفوظ ہیں؟ لوگوں کا سکون محفوظ ہے؟ لوگوں کی نیند اور لوگوں کا آرام محفوظ ہے؟ کل ہماری چھٹی ہے تو آج ڈرل مشین لے کر رات کو بارہ بجے کام کر رہے ہیں۔ پڑوسی کا بیڑا غرق ہو رہا ہے‘ فکر ہی کوئی نہیں۔ یہ دین صرف چند رسوم (rituals) کا نام نہیں ہے۔ modes of worship کا نام نہیں ہے۔ کچھ عقیدوں کا ذکر کر دینے کا نام نہیں ہے۔ کچھ عقائد کے مباحث کو پیش کر دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ active دین ہے۔ اس کا تو نام ہی ’’اسلام‘‘ ہے‘ جس کا مطلب ہے: سرِتسلیم خم کرنا۔ یہ سرنڈر زندگی کے تمام گوشوں میں ہوگا۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے!

انسان یہ حرکتیں کیوں کر جاتا ہے؟ ہلکا سا فائدہ اٹھا کر اتنا برا کردار کیوں اختیار کرتا ہے؟

اتنی گراوٹ پر کیوں آ جاتا ہے؟ فرمایا:

﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴﴾

’’کیا اُن کو یہ گمان نہیں کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں!‘‘

کیا وہ یہ خیال نہیں رکھتے کہ انہیں دوبارہ زندگی عطا کی جائے گی۔ کوئی مسلمان ہونے کا دعوے دار ہو اور پھر یہ حرکت کرے تو ایسا لگتا ہے کہ اسے گویا یقین نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ بھول گیا کہ اللہ اس کے ساتھ ہے:

﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ط﴾ (الحدید:۴)

’’اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔‘‘

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ط﴾ (البقرۃ:۲۸۴)

’’اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو خواہ چھپاؤ‘ اللہ تم سے اس کا محاسبہ کرلے گا۔‘‘

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ج وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۝۱۶﴾ (قٓ)

’’اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے۔ اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔‘‘

﴿اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ (فاطر:۳۸، الملک:۱۳)

’’بے شک وہ سینوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔‘‘

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یٰبُنَیَّ اِنَّھَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِھَا اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝۱۶﴾ (لقمٰن)

’’اے میرے بچے! اگر وہ (کوئی اچھا یا برا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو‘ پھر وہ ہو کسی چٹان میں یا آسمانوں میں یا زمین کے اندر‘ اُسے اللہ لے آئے گا۔ یقیناً اللہ بہت باریک بین‘ ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔‘‘

پھر یہ حرکت کیوں ہوتی ہے؟ ڈنڈی کیوں ماری جاتی ہے؟ کیا وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ انہیں دوبارہ زندگی دے کر کھڑا کیا جائے گا:

﴿لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝۵﴾
”ایک بڑے دن کے لیے۔“
﴿يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۶﴾ (المطففین)
”جس دن کہ لوگ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے ربّ کے سامنے۔“

ساری تان یہاں آ کر ٹوٹتی ہے۔ اللہ ربّ العزت ہر بات کا علم رکھنے والا اور ہر بات پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ان دو صفات کے ساتھ بار بار کُل کا لفظ کیوں آتا ہے؟ ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمد ؒ فرماتے تھے کہ یہ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس اشکال کا جواب ہے کہ کیسے مُردے زندہ کر دیے جائیں گے اور ایک ایک بات پیش ہو گی۔ اللہ تعالیٰ میکرو لیول کی باتیں ہی نہیں، مائیکرو لیول کی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ سینے کے رازوں سے بھی واقف ہے۔ جب اللہ کے سامنے پیشی ہونی ہے تو یہ حرکتیں کیوں ہوتی ہیں؟ دراصل یہ یقین نہیں رہتا کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ یقین نہیں رہتا کہ مجھے مرنے کے بعد اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ میرے اور آپ کے عمل پر سب سے زیادہ آخرت کا عقیدہ اثر انداز ہوتا ہے۔ جتنا موت کا یقین ہو گا، جتنا کل کی جواب دہی کا احساس ہو گا اتنا سات پردوں میں بھی سیدھے رہیں گے۔ غلطی ہو جائے تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ معصوم صرف پیغمبر ہوتے ہیں، ہم تو سب خطاکار ہیں۔ توبہ کر لو، اللہ معاف کر دے گا لیکن زندگی کا رخ تو سیدھا رکھو۔ اللہ کرے کہ وہ رخ ہو جو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ مومن وہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔

تکبر کا اظہار کرنے والے کلمہ گو مسلمان تو ہوں گے لیکن صاحبِ ایمان اس معنی میں نہیں کہ دل میں وہ یقین ہو جو بندے کے عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تکبر، دنیا پرستی ہو، اختیار کا غلط استعمال ہو، ڈنڈی مارنے کا معاملہ ہو، خیانت، جھوٹ اور دھوکے کا معاملہ ہو، طاقت کا غلط استعمال کر کے لوگوں کا مال ہڑپ کرنے کی بات ہو، اپنے لیے معیار کچھ ہو جبکہ دوسرے کے لیے کچھ اور ہو جائے، یہ حرکتیں تبھی ہوتی ہیں جب بندہ دل سے یقین نہیں رکھتا کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ بھول جاتا ہے کہ مجھے مر کر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ بھول جاتا ہے کہ کل ایک ایک بات کا حساب دینا ہے۔ سورۃ الزلزال میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾

”تو جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن بھی کوئی نیکی کی ہو گی وہ اُسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرے کے ہم وزن بھی کوئی برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔“

اسی لیے بڑا پیارا جملہ ہے، بزرگوں کا قول ہے کہ جو کرنا ہے کر لو، بس یہ سوچ کر کرو کہ اللہ پوچھے گا ضرور۔ اللہ کے سامنے تمہاری پیشی تو ہو گی۔ نماز کی ہر رکعت میں ہم اسی کو دہرا رہے ہوتے ہیں:

﴿مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝﴾ (الفاتحۃ)
”جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔“

یہ اوپر سے نیچے تک سارا بگاڑ کیوں ہے؟ میں نے ابھی سیاست دانوں کی بات نہیں کی۔ ادھر بھی یہی مسئلہ ہے۔ جب حکمران بنتے ہیں تو رویے کچھ اور ہوتے ہیں، جب اپوزیشن میں ہوتے ہیں تو رویے کچھ اور ہوتے ہیں۔ کل کی اپوزیشن والے آج حکمران بنے ہوئے ہیں جبکہ آج جو اپوزیشن میں ہیں وہ کل حکمران تھے۔ اہلِ اقتدار کے ہاں بھی، اپوزیشن والوں کے ہاں بھی، دینی طبقات میں بھی، عوام الناس میں بھی اپنے لیے معیار کچھ اور ہے جبکہ دوسرے کے لیے کچھ اور۔ تبھی یہ بگاڑ اور فساد کا معاملہ ہے۔ ہمارا دین صرف عقیدے کی اصلاح کی بات نہیں کرتا۔ آج کچھ لوگ عقیدے کی اصلاح پر ہی لگ گئے ہیں اور اسی کے مباحث میں الجھ گئے ہیں۔ بال کی کھال نکالنے پر لگ گئے ہیں۔ میرا سادہ سا سوال ہے کہ کسی غیر مسلم کو مسلمان کرنے کے لیے کتنا عقیدہ پڑھائیں گے؟ کتنی کتابیں پڑھائیں گے؟ کتنے کورسز کرائیں گے؟ ہم نے کن کن گوشوں کے اندر جا کر مباحث شروع کر دیے جبکہ عمل کے میدان میں جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے! دبئی میں بیٹھا مسلمان کہتا ہے ہندو کے ساتھ کاروبار کرنے میں آسانی ہے، مسلمان کے ساتھ کاروبار کرنے میں مشکل ہے۔ استغفر اللہ! یہ ہمارے کردار ہیں اور پھر دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہیں۔ اس دعوے کے بارے میں revisit کرنے کی ضرورت ہے۔ دل میں یقین ہو گا تو عمل اس کا ثبوت پیش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ کیفیت عطا فرمائے کہ مومن وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد آئے!

❁❁❁

دی گریٹ گیم

ایوب بیگ مرزا

طاقت کا حامل ہونے اور اقتدار پر قابض ہونے کو انسانی فطرت کا تقاضا تو نہیں کہہ سکتے البتہ یہ انسانی جبلت کا تقاضا یقیناً ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر پہلے انسان اور اللہ کے پہلے پیغمبر تھے لیکن ان کی اولاد میں اقتدار اور قبضہ کی کہانی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب قابیل نے ایک ایسی خاتون کو اپنانے کی خاطر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا جس سے شادی کرنا اُس وقت کا سسٹم یا طریقہ کار ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ انسانی تاریخ میں فطری تقاضے کو رد کر کے طاقت کے بل بوتے پر اپنی خواہش کی تکمیل کی پہلی واردات یا واردات ڈالنے کی کوشش تھی۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ پہلا انسانی قتل ہوا اور طاقت کا استعمال کر کے ہوا۔ پھر جب اجتماعیت مرحلہ وار وجود میں آئی یعنی فرد، خاندان، معاشرہ قبائلی نظام سے آگے بڑھا اور شہری حکومتیں، ریاستیں اور بالآخر عظیم ریاستیں قائم ہوئیں تو اقتدار پر جائز، ناجائز قبضہ کی خواہش بڑھتی چلی گئی۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ خواہش نہایت خوف ناک حد تک بڑھ گئی۔ اس کے مناظر بڑی آسانی سے تاریخ کے اوراق میں دیکھے اور پڑھے جاسکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اِسی طاقت کی نمائش ہوتی رہی۔ کبھی کبھار اس طاقت کا استعمال انسانیت کے لیے ثمر آور ہوا، باقی تاریخ ظلم وستم اور جبر و استبداد سے بھری پڑی ہے۔ کبھی انسانی کھوپڑیوں کے پہاڑ بنائے گئے۔ ایشیا اور افریقہ میں کبھی چنگیزیت اور یزیدیت نے انسانیت کو رسوا کیا۔ سولہویں صدی میں یورپ میں شراب دُشمن کے چہرے پر پھینک کر باہمی خون ریزی ہوتی تھی۔ پھر جب یورپ کے کچھ ممالک ریاستی سطح پر طاقتور ہوئے تو انہوں نے افریقہ کے سیاہ رنگ والوں کے ساتھ جو کچھ کیا، امریکہ کے ریڈ انڈینز کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر انسانی شرف کا تماشا بنایا، تو یہ بھی انسانی تاریخ کا

ایک ناقابلِ فراموش سیاہ باب تھا۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب نے مالی وسائل میں اضافہ کیا تو مادہ، سرمایہ اور دولت کی لوٹ کھسوٹ اگرچہ پہلے بھی تھی، لیکن اِس انقلاب نے اُسے طاقت اور اختیار کا جزوِ لاینفک بنا دیا۔ اب طاقت زمینی قبضے بھی کرنے لگی اور مقبوضہ علاقوں کے تمام تر وسائل کو مالِ غنیمت قرار دیا جانے لگا۔

بیسویں صدی کی دو عالمی جنگیں مالی اور جانی نقصانات کے حوالے سے آج کی تاریخ تک کی بدترین جنگیں تھیں۔ اس کے بعد کچھ بڑے بیٹھے بلکہ صحیح تر الفاظ میں اُنہیں بٹھایا گیا تو چند قواعد وضوابط بنائے گئے، جس سے یہ تاثر دیا گیا یا ظاہر کیا گیا کہ اب عالمی امن کے حوالے سے پیش رفت ہوگی۔ پہلے سے قائم شدہ لیگ آف نیشنز کو رد کر کے تنظیم اقوامِ متحدہ (UNO) بنائی گئی اور کہا گیا کہ اب جارحیت جواب دہ ہوگی۔ لیکن افسوس، صد افسوس کہ جو حقائق سامنے آئے ہیں اُن کی رُو سے اقوامِ متحدہ جیسے ادارے کے بھی دو چہرے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ طاقت نے سب ضوابط اور قوانین کو دبوچ لیا ہے اور اب U.N.O کو بجا طور پر طاقتور ریاستوں کی کنیز کہا جا رہا ہے۔ تمام طے شدہ ضوابط اب چھوٹے اور کمزور ممالک کے لیے رہ گئے ہیں۔ بڑی طاقتور ریاستیں اپنے ناجائز زمینی قبضے اور وسائل پر ایسی ایسی قانونی موشگافیاں کرتی ہیں کہ کمزوروں کے پاس ہاں میں ہاں ملانے اور ''یس سر'' کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ اپنے مفادات کے قتلِ عام کا خود نظارہ کرتی ہیں لیکن بے بس اور مجبور ہیں۔ اصلاً ع: ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔''

راقم کی رائے میں جس دور کو دورِ جہالت کہا جاتا تھا، اب وہ خوب صورت لباس زیب تن کیے ہوئے درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اسے قانونی لبادہ بھی اوڑھا دیا گیا ہے۔ اسے تہذیبِ نو کا نام دیا گیا ہے اور اِس کے حق میں ایسے دلائل دیئے جاتے ہیں اور منطقی جواز پیش کیے جاتے ہیں کہ ہر صحیح فہم رکھنے والا انسان سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ اصلیت سب جانتے ہیں لیکن طاقت نے زبان پر تالے لگا دیے ہیں۔ گویا منافقت اپنے عروج پر ہے۔ البتہ داد دیجیے امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو کہ اُس نے مکمل طور پر نہ سہی، کافی حد تک اس منافقت کا پردہ چاک کیا ہے۔ اسے بے باکی یا بے شرمی کہہ لیجیے جب وہ صاف صاف کہتا ہے کہ فلاں ملک کے فلاں علاقہ میں معدنی دولت ہے، مَیں طاقت استعمال کر کے اس پر قبضہ کروں گا۔ وہ اِسے اپنا حق جتلاتا ہے

اور کہتا ہے کہ امریکہ کو اپنی ’’غربت‘‘ دور کرنے کے لیے قبضے کرنے ہوں گے اور مالِ غنیمت سمیٹنا ہوگا۔ یہ امریکہ کا حق ہے‘ کیونکہ اُسے اپنی مالی عظمتِ رفتہ کو واپس لانا ہے۔ عالمی قوانین کی ایسی تیسی‘ یہ میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ وینزویلا پر حملہ بھی اس حوالے سے انتہائی اہم قدم ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ۳ جنوری ۲۰۲۶ء کو رات کے اندھیرے میں وینزویلا پر حملہ کر دیا‘ جس میں امریکی فضائیہ کے ۱۵۰ جنگی طیارے استعمال کیے گئے۔ ہیلی کاپٹر سے فوج بھی زمین پر اتاری گئی۔ یہ کارروائی اتنی اچانک اور فوری کی گئی کہ وینزویلا کی فوج سنبھل ہی نہ سکی اور امریکی افواج صدارتی رہائش گاہ میں داخل ہو کر صدر مادورو اور ان کی اہلیہ کو اغوا کر کے امریکہ لے گئیں۔ بعدازاں وینزویلا کی طرف سے کچھ مقابلہ ہوا‘ لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق امریکہ نے ایسا زہریلا بارود استعمال کیا کہ وینزویلا کے فوجیوں کے ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا‘ لہٰذا انہوں نے سرنڈر کر دیا۔ امریکہ نے یہ مجرمانہ واردات پہلی مرتبہ نہیں ڈالی۔ ۱۹۸۹ء میں وہ پاناما کے ساتھ بھی یہ سب کچھ کر چکا ہے جب وہاں کے ڈکٹیٹر جنرل نوریگا کو اسی طرح کے آپریشن سے گرفتار کیا گیا تھا۔

یاد رہے کہ ٹرمپ گزشتہ سال نوبل پرائز کا امیدوار تھا۔ پاکستان کی حکومت نے بڑے جوش و خروش سے صدر ٹرمپ کو امن کا نوبل پرائز دینے کے لیے سفارش کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وینزویلا کی خفیہ ایجنسیاں بڑی بُری طرح ناکام ہوئیں۔ وہ امریکی خفیہ ایجنسیوں کی حرکات وسکنات کا درست نوٹس نہ لے سکیں اور اپنی حکومت کو اس سے آگاہ نہ کر سکیں۔ یوں امریکہ کا کام آسان ہو گیا۔ اب تو یہ اطلاعات بھی آ رہی ہیں کہ وینزویلا کے آرمی چیف کو بہت بڑی رشوت دی گئی تھی۔ درحقیقت نادیدہ عالمی قوتیں‘ جنہیں خلائی قوتیں کہنا زیادہ مناسب ہوگا‘ یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ کس ملک میں کس کو طاقت یا اقتدار سے نوازنا ہے۔ امریکہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ کوئی امریکی شہری صدارتی انتخاب میں بطور امیدوار مؤثر طور پر حصہ ہی نہیں لے سکتا جب تک اُسے اِن نادیدہ عالمی قوتوں سے N.O.C نہ مل جائے۔ ڈیموکریٹ اور ری پبلکن امریکہ کی دونوں بڑی جماعتیں اپنے صدارتی امیدوار کے لیے اِن قوتوں کے اجازت نامے کی محتاج ہوتی ہیں۔ اُن ہی کا فیصلہ تھا کہ نوبل پرائز ٹرمپ کو نہیں بلکہ وینزویلا کی اپوزیشن لیڈر کورینا مچادو کو دیا جائے گا۔

ان عالمی قوتوں کی منصوبہ بندی بڑی گہری اور خفیہ ہوتی ہے۔ اکثر اوقات اس سے وہ حکومت بھی آگاہ نہیں ہوتی جس سے اُنہوں نے کوئی بڑا کام لینا ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وینزویلا میں کارروائی سے پہلے امریکہ وینزویلا کی اپوزیشن لیڈر مچادو کو اس آپریشن کے لیے استعمال کرتا رہا اور یہ تاثر دیتا رہا کہ وقت کی حکومت کا کام تمام کر کے وہ حکومت مچادو کے سپرد کر دے گا‘ لیکن کامیابی کے بعد مچادو کو دھوکا دیتے ہوئے حکومت کسی اور کو دے دی ہے۔

بہرحال وینزویلا پر دہشت گردانہ حملے کی وجوہات اب سامنے آ رہی ہیں۔ اس کے تیل کے ذخائر ۳۰۳ بلین بیرل بتائے جاتے ہیں‘ جو شاید دنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔ امریکہ خود بھی تیل پیدا کرنے والا ملک ہے جبکہ اُس کے ذخائر صرف ۵۵ بلین بیرل ہیں۔ جب وینزویلا میں تیل کے ذخائر دریافت ہوئے تھے تب ہی امریکی کمپنیوں نے وہاں کا رخ کیا تھا اور تیل نکالنا شروع کر دیا۔ ۱۹۹۸ء میں وینزویلا کے ایک فوجی افسر ہیوگو شاویز نے بغاوت کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ وہ ہر اتوار کو ٹیلی ویژن پر چھ گھنٹے عوام سے خطاب کرتا اور ایسی باتیں کہتا جو امریکہ کو سخت ناگوار گزرتی تھیں۔ وہ سوشلسٹ نظریات رکھتا تھا۔ اِسی لیے صدر ٹرمپ نے کہا ہے کہ تیل ہماری کمپنیوں نے نکالا تھا لیکن سوشلسٹ حکومت نے ڈاکا زنی کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وینزویلا کے حوالے سے ٹرمپ کے منہ سے جو رال ٹپکی ہے اُس کی وجہ صرف تیل نہیں ہے بلکہ وہاں Rare Earth Minerals کی بھی بہتات ہے۔ ٹرمپ سیاست دان نہیں ایک سوداگر ہے۔ لہٰذا اِس قبضہ سے معدنی دولت بھی حاصل ہوگی۔ علاوہ ازیں‘ وینزویلا پر امریکی حملے کی سیاسی اور عسکری وجوہات بھی ہیں۔ کچھ عرصہ سے وینزویلا کے ایران سے تعلقات بہت بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ایران نے وینزویلا میں ایک نیول بیس بنا لیا تھا۔ وینزویلا نے ایران سے مہاجر سکس ڈرون طیارے بھی خریدے۔ صدر مادورو کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اس نے حماس اور حزب اللہ کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ طاقت کے نشے میں چُور امریکہ اپنی حیثیت کے حوالے سے مختلف نعرے لگاتا رہا ہے۔ سوویت یونین جب شکست و ریخت سے دوچار ہوا تو بش اول نے نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ لگایا اور واضح الفاظ میں کہا کہ اب دنیا میں وہی ہوگا جو امریکہ چاہے گا۔ پھر

نائن الیون کے بعد بش دوئم نے اپنے حلیف اور حریف دونوں ممالک کو either with us or against us کی دھمکی دی۔ اب ٹرمپ دنیا کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ تمام معدنیات اور دولت ہمارا مالِ غنیمت ہے‘ جس پر قبضہ کا امریکہ کو حق ہے۔ امریکہ یہ امر فراموش کر رہا ہے کہ ربع صدی گزر چکی ہے۔ آج ہم ۲۰۲۶ء میں ہیں۔ طاقت کے توازن میں تبدیلی آچکی ہے جس کی تفصیل راقم آگے بیان کرے گا۔ پہلے اِس بات کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ کسی ملک یا قوم کے لیے دنیا کے دوسرے معاملات‘ جھگڑوں اور تنازعات سے الگ تھلگ رہنا اب ممکن نہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ دنیا کے مسائل باہم گتھم گتھا ہو چکے ہیں اور کوئی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں۔ دنیا کو آج جس صورتِ حال کا سامنا ہے‘ یہ کیوں ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے! راقم نے جو نادیدہ قوتوں کا ذکر کیا وہ دنیا بھر میں اقتدار کی بندر بانٹ کرتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یوں تو آغاز ہی سے یہودیوں کی عظیم اکثریت بحیثیت مجموعی اس دنیا کے لیے وبال کا باعث بنی ہوئی ہے‘ لیکن صہیونیت یہودیت کی بھی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اِن صہیونیوں کو جو کسی نے اِس دنیا میں شیطان کے ایجنٹ کہا ہے تو غلط نہیں کہا۔ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ وہ امن کے بدترین دشمن ہیں اور ہر وقت دنیا کو جنگ وجدل میں اُلجھانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن کے عزائم پر گہری نگاہ رکھنے والا ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جنگی ماحول ہی میں وہ اپنے اصل ہدف کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ اُن کا ہدف گریٹر اسرائیل ہے۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے امریکہ کی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں۔ وہ امریکہ کی معیشت اور میڈیا پر قابض ہو چکے ہیں۔ لہٰذا آج دنیا میں جو گریٹ گیم چل رہی ہے‘ اُس کے منصوبہ ساز بھی وہی ہیں اور وہی عملی میدان میں اُس کو دھکیل رہے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ممالک کو اسرائیل اپنی حکمتِ عملی سے زیر کر چکا ہے۔ اب مشرقِ وسطیٰ سے باہر اُس کا پہلا بڑا شکار ایران ہے۔ ماضی قریب میں وہ ایران پر حملہ آور ہو چکا ہے لیکن غیر متوقع طور پر اُسے دندان شکن جواب ملا۔ لہٰذا وہ ایک حکمتِ عملی کے تحت پسپا ہوا اور اب ایک نئی حکمتِ عملی سے ایران پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ ایران کی معیشت پر تو امریکہ اور اسرائیل ایک عرصہ سے حملہ آور تھے۔ دنیا بھر کے ممالک پر پابندی لگائی ہوئی تھی کہ وہ ایران سے تجارت نہیں کر سکتے۔ اس پابندی کی

صرف چین‘ روس اور بھارت نے عملی طور پر مخالفت کی اور ایران سے کچھ نہ کچھ تجارت کی لیکن پاکستان سمیت دنیا کے باقی ممالک امریکہ کے ردِّعمل کے خوف سے ایران سے تجارت کرنے سے گریز کرتے رہے۔ یوں ایران کی معاشی حالت بری طرح متاثر ہوئی۔

عدل کا تقاضا ہے کہ ایران سے عالمی قوتوں کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایران کے بلنڈر کا بھی ذکر کیا جائے کہ کس طرح وہ بھی دوسرے ممالک میں مداخلت کرتا رہا جبکہ اُس کی معاشی حالت اور اقتصادی صورتِ حال ہرگز اس طرح کی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اُس نے لبنان میں مداخلت کی‘ حزب اللہ کی بے تحاشا مدد کی‘ شام کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی‘ سعودی عرب کے خلاف حوثیوں کی مدد کی۔ عراق میں باغیوں کی مدد کے لیے جا پہنچا۔ گویا وہ اس خطے میں ایرانی کریسنٹ قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ کام تھے جو امریکہ عالمی سطح پر کرتا ہے۔ ان حرکتوں سے تو امریکہ جیسی عظیم معیشت کو دھچکا لگا ہے چہ جائیکہ ایران جیسا ملک ایسی حرکات کرتا جس کی معیشت انقلاب کے بعد سے مسلسل ہچکولے کھا رہی ہے۔ ان ہی دخل اندازیوں نے ایران کی معیشت کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا۔ لہٰذا مہنگائی اور بے روزگاری عوام کو سڑکوں پر لے آئی۔

وہ مذہبی حکومت جو نصف صدی پہلے رضا شاہ پہلوی کو ملک بدر کر کے ایران میں قائم ہوئی تھی اور جس نے خود کو ولایت فقیہہ کا درجہ دیا تھا‘ آج خود مظاہرین کے سامنے بے بس نظر آ رہی ہے۔ خامنہ ای کی حکومت سارا الزام بیرونی قوتوں پر لگا رہی ہے کہ وہ سازشی اور تخریبی کردار ادا کر رہی ہیں اور ملک میں فساد کا باعث ہیں۔ بدامنی اور مظاہروں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی بھی حکومت کے خلاف مظاہروں میں بیرونی قوتوں کا اگرچہ سازشی کردار ہوتا ہے لیکن لاکھوں کی تعداد میں عوام کا سڑک پر آنا جو لاٹھی‘ گولی اور ہر قسم کے تشدد کا سامنا کرتے ہیں وہ اندرونِ ملک ہونے والے حالات اور حکومت کے خلاف غصہ اور نفرت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کہیں گڈ گورننس کا فقدان اور مہنگائی ہوتی ہے تو کہیں اداروں کی بے جا مداخلت اور حکومت سے مختلف موقف اختیار کرنا وجہ بنتی ہے۔ بہرحال ایران کو اس وقت ۱۹۷۹ء کے انقلاب کے خلاف ایک اور انقلاب کا سامنا ہے۔

راقم نے جو بیرونی سازشیوں کا تذکرہ کیا ہے تو ظاہر ہے وہ اسرائیل کی موساد اور امریکہ

کی CIA کی سرگرمیاں ہیں۔ گزشتہ سال ایران سے شکست کھانے والا اسرائیل اب نئی حکمتِ عملی کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ امریکہ جو جنگ میں اسرائیل کا پشت بان تھا‘ ان تخریبی کارروائیوں میں بھی باقاعدہ حصہ ڈال رہا ہے۔ امریکہ جسے نائن الیون کے بعد بدمست ہاتھی کہا گیا‘ عالمی سطح پر اپنی گرفت ڈھیلی ہونے پر اب desperate ہو چکا ہے اور ایک لاابالی ریاست کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وینزویلا پر حملہ بھی اِسی ذہنیت کا نتیجہ تھا اور اب صدر ٹرمپ نے یہ اعلان کیا ہے کہ اگر ایرانی حکومت نے مظاہرین (جنہیں وہ محب وطن کہتا ہے) پر تشدد کیا تو امریکہ مظاہرین کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ درحقیقت یہ اعلان غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے ذیل میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں‘ امریکہ ایران میں رجیم چینج کی باتیں بھی کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ کو دخل اندازی کا اختیار کس نے دیا ہے؟ میڈیا کے مطابق رجیم چینج کے تذکرے نے رضا شاہ پہلوی کے بیٹے اور اُس کی والدہ کو متحرک کر دیا ہے وگرنہ عوام میں صرف ہارڈ کور لبرلز کا ایک مختصر گروہ اُن کی حمایت کر رہا ہے۔ ایرانی عوام کو حقیقت میں تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ میڈیا اپنی اصطلاحات میں اُنہیں روایت پسند‘ اصلاح پسند اور رجعت پسند کے نام دے رہا ہے۔ غیر متوقع اور خطرناک بات یہ ہے کہ یہ مظاہرے leader less ہیں‘ یعنی مظاہرین کی طرف سے کوئی بڑا رہنما سامنے نہیں آسکا۔ رضا شاہ پہلوی کا فرزند پاگلوں کی طرح اسرائیل اور اُس کے وزیر اعظم نیتن یاہو کے ساتھ ساری امید لگائے بیٹھا ہے۔ اخبار میں اُس کی ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس میں وہ دیوارِ گریہ سے سر پٹخ رہا ہے۔ گویا وہ اقتدار کے لیے سیاسی نہیں‘ مذہبی حدود بھی پار کرنے کو تیار ہے۔ ظاہری طور پر نیتن یاہو اُس کی پشت پر ہاتھ رکھتا دکھائی دیتا ہے‘ لیکن اگر اسرائیلی مفادات کا تقاضا ہوا تو وہ اُس کی پشت پر خنجر بھی گھونپ سکتا ہے۔ تاہم‘ قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔

ٹرمپ کی دھمکی اور رضا شاہ پہلوی کے خاندان کا اسرائیل کے پاؤں پڑنا امریکی اور اسرائیلی سازشوں کے لیے counter productive ثابت ہو رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایرانی نہایت قوم پرست ہیں۔ لہٰذا وہاں گزشتہ چند دنوں سے صورتِ حال بدلتی نظر آ رہی ہے۔ حکومت کے خلاف مظاہروں میں کمی آ گئی ہے۔ اب ایسے مظاہرے بھی ہونے شروع ہو گئے ہیں جن میں ’’مرگ بر امریکہ‘‘ اور ’’مرگ بر اسرائیل‘‘ کے نعرے سننے میں آ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کی ایران میں مداخلت کا اگرچہ پہلے بھی کوئی جواز نہیں تھا لیکن امریکہ کی حکومت عذرِ لنگ تراشنے کی بڑی ماہر ہے۔ اپنے ناجائز ایجنڈے کی تکمیل کے لیے بڑے مضحکہ خیز جواز تراش لیتی ہے۔ لہٰذا اس تبدیلی کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب امریکہ اور اسرائیل ایران پر ہرگز حملہ نہیں کریں گے۔ صرف امکانات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ماضی میں افغانستان پر حملہ کرتے وقت اُس نے جو جواز تراش لیا تھا وہ بالکل اُسی طرح کا تھا جیسا wolf and the lamb کی کہانی میں بھیڑیا‘ بکری کے بچے کو کھانے کے لیے یہ عذر بناتا ہے کہ اگر گزشتہ سال تم نے نہیں تو تمہارے باپ نے مجھے گالی دی ہوگی۔ حقیقت میں آج دنیا میں کمزور ممالک اور اقوام کی امریکہ کے سامنے وہی حیثیت ہے جو جنگل میں بھیڑیا کے سامنے بکریوں کی ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کی ایران میں بلاواسطہ یا بالواسطہ موجودگی پاکستان کے لیے کتنی خطرناک ہوگی۔ قارئین کو شاید یاد ہو کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا تو ہلیری کلنٹن نے صاف صاف کہا تھا کہ ہم ایک rapid force تیار کر رہے ہیں جو ضرورت پڑنے پر فوری کارروائی کر کے پاکستان کے ایٹمی اثاثہ جات پر قبضہ کر لے گی۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان نے اپنے ایٹمی اثاثہ جات کے حوالے سے ایسے زبردست حفاظتی اقدامات کر لیے ہیں کہ اب کسی عالمی قوت کا قبضہ تو آسان نہیں‘ لیکن جس بات کا خدشہ ہے‘ اور یہ بڑا سنجیدہ اور سنگین خطرہ ہے‘ کہ اگر یہ اسلام اور پاکستان کے دشمن دونوں ممالک پاکستان کی بغل میں جگہ بنا لیتے ہیں تو وہ ایجنٹوں اور تخریب کاروں کے ذریعے پاکستان میں امن وامان تباہ کر سکتے ہیں اور یوں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے خلاف بھی کارروائی کر سکتے ہیں۔ پاکستان کی سلامتی کے خلاف وہ پہلے ہی کئی اقدام کر چکے ہیں‘ جس کا سب سے بڑا ثبوت پاکستان میں دہشت گرد کارروائیوں کا بڑھنا ہے۔ قصہ مختصر‘ امریکہ اور اسرائیل کی ایران میں کسی نوعیت کی موجودگی پاکستان کے لیے بہت خطرناک ہوگی۔ راقم کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ امریکہ اور اسرائیل ایران کے حوالے سے جو کچھ کر رہے ہیں‘ درحقیقت یہ صرف ایران کا مسئلہ نہیں بلکہ پاکستان کی طرف بڑھنے کے حوالے سے بھی ایک سوچی سمجھی سکیم کا حصہ ہے۔

پاکستان میں مقتدر حلقوں کو اس نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسرائیل کو ایران سے محدود خطرہ ہے اور حالیہ جنگ میں اُسے ایران کی جنگی استعداد کا صحیح اندازہ ہو چکا ہے۔ ایران کی جنگی قوت میں اضافہ کے امکانات بہت کم ہیں۔ میڈیا میں ایسی خبریں گشت کر رہی ہیں کہ روس اور چین کچھ اسلحہ اور دفاعی نظام ایران کو دینے والے ہیں لیکن اِس کے باوجود ہماری رائے میں روس اور چین اُس کی حربی قوت میں کوئی بڑا اضافہ نہ کر سکیں گے جو انقلابی تبدیلی لے آئے‘ جبکہ امریکہ اسرائیل کا مائی باپ ہے۔ ۱۹۷۳ء کی مصر اسرائیل جنگ میں امریکہ نے واشنگٹن اور تل ابیب کے درمیان ایسا فضائی پل قائم کر دیا تھا جس کے ذریعے اسرائیل کو دھڑا دھڑ اسلحہ پہنچایا گیا اور وہ شکست کھاتے کھاتے فاتح بن گیا۔ اس پر مصر کے صدر انوار سادات نے کہا تھا کہ ہم اسرائیل سے تو لڑ سکتے ہیں‘ امریکہ سے نہیں۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ مصر اسرائیل کا دست و باوز بن کر فلسطینیوں کے قتل عام میں حصہ دار بن چکا ہے‘ یعنی وہ امریکہ اور اسرائیل کے سامنے مکمل طور پر بچھ چکا ہے۔ لہٰذا اگر اسرائیل دوبارہ ایران پر حملہ کرتا ہے تو ایسا مکمل طور پر امریکہ کی سرپرستی میں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ ایران اسرائیل کو نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن اسے تباہ و برباد کرنا یا ایک مکمل شکست دینا قریباً ناممکن ہے‘ جبکہ پاکستان ایٹمی صلاحیت کا حامل ہونے اور تباہ کن میزائل رکھنے کی وجہ سے اسرائیل کو ملیا میٹ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسرائیل کو اصل خطرہ پاکستان سے لاحق ہے۔

پاکستان بدقسمتی سے اِس وقت سیاسی اور معاشی طور پر بدترین عدم استحکام کا شکار ہے۔ یقیناً پاکستان کی فوج نہایت پروفیشنل ہے‘ اُس کے سپاہی بہادر اور جری ہیں لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ عسکری قیادت اور عوام کی عظیم اکثریت ایک پیج پر نہیں ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔ تاریخ کا واضح فیصلہ ہے کہ وہ فوج جنگ جیتتی ہے جس کی پشت پر عوام ہوں۔ بیرونی تجارتی کمپنیاں پاکستان میں اپنا کاروبار ختم کر کے واپس جا رہی ہیں‘ یہاں تک کہ پاکستان کے سرمایہ دار بھی بوریا بستر لپیٹ کر دوسرے ممالک میں اپنے کاروبار جما رہے ہیں۔ بہت سی صنعتیں بند ہو چکی ہیں۔ بیرونی سرمایہ داری نہ ہونے کے برابر جبکہ تجارتی خسارہ خوف ناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ بجلی اور گیس اس قدر مہنگی ہیں کہ پاکستانی صنعت کار اور تاجر عالمی مارکیٹ سے آؤٹ ہو گیا ہے۔ پھر یہ کہ ملک میں ہائبرڈ نظام اور ایک ایسی حکومت قائم ہے جس کے خلاف عوام میں

شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ یہ اقلیتی حکومت خود کو پاکستان کے عوام پر مسلط کرنے کے لیے ناجائز طریقے سے ریاست کے تمام اداروں پر قبضہ کر چکی ہے‘ خاص طور پر آئین میں ۲۶ ویں اور ۲۷ ویں ترامیم کر کے عدلیہ کو تہ و بالا کر دیا گیا ہے جس سے ملک میں عدل کا فقدان ہے۔ جنگ میں فتح کے حوالے سے برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل کا یہ مقولہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے کہ اگر ہماری عدالتیں انصاف دے رہی ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اِس وقت عدل عنقا ہو چکا ہے۔

پھر یہ کہ پاکستان معاشی لحاظ سے تباہی کی طرف گامزن ہے۔ بیروزگاری میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مہنگائی کا جن بے قابو ہو چکا ہے۔ امریکہ کو خوش کرنے کے لیے افغانستان سے بگاڑ پیدا کر لی گئی ہے جس کا نقصان یہ ہوا کہ مشرق میں اگر ہمارا ازلی دشمن بھارت ہے جو دن رات پاکستان کے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے تو شمال مغرب میں افغانستان ہمارا دشمن بن کر سامنے آیا ہے۔ گویا ہم جغرافیائی لحاظ سے بھارت اور افغانستان کے درمیان سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔ اس حکومت نے تو بعض ایسے اقدامات بھی کیے تھے کہ خطے میں ہمارا پرانا اور وفادار دوست چین ناراض ہو گیا تھا۔ وہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ چین کو بھارت دشمنی اور اپنی جغرافیائی صورت حال کی وجہ سے دفاعی اور عسکری لحاظ سے پاکستان کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو ناراض کرنا چین کو وارا نہیں کھاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے کہ خطے میں اُسے کسی صورت ignore نہیں کیا جا سکتا! لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ پاکستان موجودہ سیاسی عدم استحکام کو ختم کرے اور فریقین اپنے مفادات اور اپنی انا کے جال میں پھنسے رہنے کی بجائے صرف ملک اور قوم کے مفاد کو مدِنظر رکھیں۔ افراد آتے جاتے رہتے ہیں‘ صرف ریاست کی سلامتی اور عوام کی فلاح مقصود و مطلوب ہونی چاہیے۔ راقم کی رائے میں پاکستان کے تمام مسائل اور مصائب کی اصل وجہ یہ ہے کہ قوم خاص طور پر اس کے رہنما تحریک پاکستان کے دوران لگائے گئے نعرے ’’پاکستان کا مطلب کیا‘ لا الٰہ اِلّا اللّٰہ!‘‘ کو نہ صرف فراموش کر چکی ہے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ریاست کھلے عام خلافِ اسلام قانون سازی کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ گریٹ گیم کے عالمی کھلاڑیوں سے ہماری حفاظت فرمائے اور ہمیں صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁❁❁

روزہ: برکات اور آفات

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

شہوات اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کی حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے‘ اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے‘ بالخصوص تزکیۂ نفس کے جتنے طریقے بھی‘ صحیح یا غلط‘ دنیا میں اب تک اختیار کیے گئے ہیں‘ ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے آداب و شرائط‘ اسلام کی نسبت سے زیادہ سخت تھے۔ اسلام دینِ فطرت ہے‘ اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں‘ جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی کی تربیت و اصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے۔ اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفسِ انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زور دار ہیں‘ ان میں شہوات‘ خواہشات اور جذبات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی فطرت میں اشتعال‘ ہیجان اور جوش ہے‘ اس وجہ سے ارادہ کو ان پر قابو پانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجائے ان کے یک قلم ختم کر دینے کی

تدبیریں سوچیں اور اختیار کیں‘ لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزاء میں سے ہیں‘ جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے‘ بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے‘ لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہ سوار بڑی ریاضتوں‘ بڑی مشقتوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی برکات

روزے کی عبادت اسلام نے اس لیے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفسِ انسانی کے یہ سرکش رجحانات ضعیف ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوتِ ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدودِ الٰہی کا پابند بنانے کے لیے طاقت ور ہو جائے۔ اپنے اس دوطرفہ عمل کے سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے‘ جیسا کہ ہم نے عرض کیا‘ اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ پہلے اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے‘ اس کے بعد اس کی آفات بیان کریں گے۔

روحِ ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی روحِ ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روحِ ملکوتی کا حقیقی میلان ملأ اعلیٰ کی طرف ہے۔ وہ فطری طور پر خدا کے تقرب‘ ملائکہ سے تشبّہ اور سفلیات سے تجرد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجائے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لیے پرواز کرنا چاہتی ہے۔ روح کے ان تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں‘ جو خواہشات و شہوات سے پیدا ہوتے ہیں‘ ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات و شہوات ہی کو ہوتی ہے۔ اس کہ وجہ یہ ہے کہ

خواہشات وشہوات کے مطالبے پورے کر دینے سے انسان کو فوری لذت وراحت حاصل ہوتی ہے۔ برعکس اس کے‘ روح کے مطالبات پورے کرنے سے انسان کو کوئی فوری لذّت حاصل نہیں ہوتی بلکہ الٹے اس کے لیے انسان کو اپنی بہت سی فوری لذتوں اور راحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

یہ صورت حال ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت عرصہ تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو پھر نہ صرف یہ کہ اس کی قوتِ پرواز ختم ہوجاتی ہے‘ بلکہ آہستہ آہستہ وہ خود بھی ختم ہوجاتی ہے۔

روزہ اس صورتِ حال میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو شہوات وخواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہوجاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دل چسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عائد ہوجاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہوانی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہوجاتی ہیں اور روحِ ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لیے موقع مل جاتا ہے۔

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں‘ سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں‘ لیکن روزے میں دنیا اور لذّاتِ دنیا کو ترک کر کے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبّہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں مشقت اٹھاتا ہے‘ وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر‘ درویشی‘ زہد‘ تجرد‘ ترکِ دنیا اور تبتّل اِلی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے‘ وہ اس کا خاص حصہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں جائز رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیتِ نفس کے لیے اس کو پسند فرمایا ہے‘ اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لیے جھیلتا ہے کہ اس کی روح اس عالمِ ناسوت کی دلدل سے آزاد ہوکر عالمِ لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ خاص

نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ: كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهُ إِلَّا الصِّيَامَ، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ، وَإِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ، فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ، فَلْيَقُلْ: إِنِّي امْرُؤٌ صَائِمٌ. وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَخُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ. لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ يَفْرَحُهُمَا: إِذَا أَفْطَرَ فَرِحَ، وَإِذَا لَقِيَ رَبَّهُ فَرِحَ بِصَوْمِهِ)) [صحیح البخاری: ۱۹۰۴]

’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اُس کے لیے ہے‘ مگر روزہ‘ یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہیے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور وشغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہے کہ بھائی‘ میں روزے سے ہوں۔ اُس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمد (ﷺ) کی جان ہے‘ روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔‘‘

مزید روایات میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم ان کو بھی یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

((يَتْرُكُ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَشَهْوَتَهُ مِنْ أَجْلِي. الصِّيَامُ لِي، وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا)) [صحیح البخاری: ۱۷۹۴]

’’(اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے۔‘‘

حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَة ضِعْفٍ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: إِلَّا الصَّوْمَ فَإِنَّهُ لِي، وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ

مِنْ أَجْلِي، لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ، وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ، وَلَخُلُوفُ فِيهِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ)) [صحیح مسلم:١١٥١]

''ابنِ آدم کا ہر عمل بڑھایا جائے گا' یعنی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی' مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی خواہش اور اپنا کھانا پینا میرے لیے قربان کرتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے' دوسری خوشی اس کو اپنے رب کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی۔ اور اس کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔''

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے۔

اس کو اپنے لیے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اُس کی رضا اور اُس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے جن کا اس کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادی خوشیاں اور تمام مادی لذتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ ان لذتوں سے محض اللہ کی رضا کے لیے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اُس نے اسے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لیے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات و خصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجیے ایک نیکی ساز گار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے' یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق و اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیے' وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہوگا اور ہر حق دار اس اجر کو حاصل کر لے گا' لیکن روزے کی جو عبادت ہے' اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے' بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق

ہوگا جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ جب جزا دینے کا وقت آئے گا' تب وہی اس کو کھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزہ رکھنے والے کو صلہ دے گا۔ جس عبادت کی جزا کے لیے یہ کچھ اہتمام ہوگا' کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین سب کا مالک اس کی کیا جزا دے گا۔

سدِّ ابوابِ فتنہ

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ آدمی کے اندر فتنہ کے جو بڑے بڑے دروازے ہیں' روزہ ان کو بہت بڑی حد تک بند کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر فتنے کے بڑے دروازے' جیسا کہ ایک سے زیادہ حدیثوں میں تصریح ہے' بطن اور فرج ہیں' انہی کے سبب سے آدمی نہ جانے خود کتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں معلوم کتنی ہلاکتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی راستے ہیں جن سے شیطان انسان پر سب سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی حفاظت کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے لیے جنت کی ضمانت دی ہے جو شخص ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دے سکے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ)) [صحيح البخاري: ٦١٠٩]

''جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں کلّوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہیں' میں اس کے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔''

روزہ ان کی حفاظت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتا ہے۔ انسان کے لیے روزے میں صرف کھانا پینا ہی حرام نہیں ہو جاتا' بلکہ لڑنا جھگڑنا' جھوٹ بولنا' غیبت کرنا اور غیر ضروری باتوں میں حصہ لینا بھی روزے کے مقصد کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روزے میں صرف شہوانی تقاضوں کا پورا کرنا ہی حرام نہیں ہو جاتا' بلکہ وہ تمام چیزیں بھی روزے کے منشا کے خلاف ہیں جو اس کے شہوانی میلانات کو شہ دینے والی ہوں۔ روزہ خود بھی ان میلانات کو ضعیف کرتا ہے اور روزہ دار کو بھی ہدایت ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو ان تمام مواقع سے دور رکھے جہاں سے اس کے ان رجحانات کو غذا بہم پہنچ جانے کا امکان ہو۔

فتنہ کے دروازوں کے بند ہو جانے سے اس کے لیے ان کاموں کا کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے جو خدا کی رضا کے کام ہیں اور جن سے جنت حاصل ہوتی ہے جبکہ ان کاموں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف کام ہیں اور جن کے سبب سے آدمی دوزخ میں پڑے گا۔ شیطان اس کے آگے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری چوکڑی بھول جاتی ہے۔ وہ ڈھونڈتا ہے‘ لیکن اس کو روزہ دار پر حملہ کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں ملتی۔ یہی حقیقت ہے جو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ، فُتِحَتْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ جَهَنَّمَ، وَسُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ)) [صحيح البخاری:١٨٩٩]

’’جب رمضان کا مہینا آتا ہے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں‘ دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔‘‘

قوتِ ارادی کی تربیت

روزے کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کی قوتِ ارادی کی بہترین طریقہ پر تربیت کرتا ہے۔ شریعت کی حدود کی پابندی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کی قوتِ ارادی نہایت مضبوط ہو۔ بغیر مضبوط قوتِ ارادی کے یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص شہوات و جذبات اور خواہشات کے غیر معتدل ہیجانات کو دبا سکے‘ اور جو شخص ان کے مفرط ہیجان کو دبا نہیں سکتا‘ اس کے لیے یہ محال ہے کہ وہ شریعت کی حدود کو قائم رکھ سکے۔ ایک ضعیف اور لجلجے ارادہ کا آدمی ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ جب بھی کوئی چیز اس کے غصہ کو اشتعال دلانے والی سامنے آجائے گی‘ وہ بڑی آسانی سے اس سے مغلوب ہو جائے گا۔ جب بھی کوئی طمع پیدا کرنے والی چیز اس کو اشارہ کر دے گی‘ وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا‘ اور جہاں بھی کوئی چیز اس کو اکسانے والی نظر آجائے گی‘ وہیں وہ پھسل کے گر پڑے گا۔ اس طرح کی ضعیف قوتِ ارادی کا انسان دنیا میں عزم و ہمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتا‘ چہ جائیکہ وہ شریعت کی حدود و قیود کی پابندی کر سکے۔ بالخصوص شریعت کا وہ حصہ جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے‘ مضبوط صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس صبر کی مشق روزے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی صبر سے وہ

تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو روزے کا اصل مقصود ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾﴾ (البقرة)

’’اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے‘ جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا‘ تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔‘‘

’’تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو‘‘ یعنی تاکہ صبر اور برداشت کی تربیت سے تمہاری قوتِ ارادی مضبوط ہو اور تمام ترغیبات و تحریکات اور تمام مشکلات و موانع کا مقابلہ کر کے تم شریعت کی حدود پر قائم رہ سکو۔ یہی قوت مومن کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جس سے وہ شیطان کے ہر وار کو روک سکتا ہے جو وہ خواہشات و جذبات اور شہوات کی راہ سے اس پر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس حدیث میں‘ جو اوپر گزر چکی ہے‘ روزے کو ایک ڈھال کہا گیا ہے اور روزہ دار کو یہ ڈھال استعمال کرنے کی تعلیم یوں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ یا لڑائی جھگڑا شروع کر دے تو اس سے کہے کہ میں روزے سے ہوں۔

جذبۂ ایثار کی پرورش

روزے سے انسان کے اندر جذبۂ ایثار کی بھی پرورش ہوتی ہے اور یہ جذبہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات میں سے ایک ہے جن سے ہزاروں نیکیوں کے لیے اس کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب روزے میں بھوکا پیاسا رہتا ہے اور اپنی دوسری خواہشوں کو بھی دبانے پر مجبور ہوتا ہے تو اس طرح اسے غریبوں‘ فاقہ کشوں‘ محتاجوں اور مظلوموں کے دکھ درد اور ان کے شب و روز کا اندازہ کرنے کا بذاتِ خود موقع ملتا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس کا مزہ چکھ کر بھوکوں اور پیاسوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر قدرتی طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔ روزے کا یہ اثر ہر شخص پر اس کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پڑتا ہے‘ کسی پر کم پڑتا ہے‘ کسی پر زیادہ۔ لیکن جس شخص کے روزے میں روزے کی خصوصیات موجود ہیں‘ اُس پر روزے کا یہ اثر پڑتا ضرور ہے۔ جن کا جذبۂ ایثار کمزور ہوتا ہے‘ روزہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی متحرک کر دیتا ہے‘ اور جن کے اندر یہ جذبہ قوی ہوتا ہے ان کے لیے تو روزوں کا مہینا اس جذبہ کے ابھرنے کے

لیے گویا موسم بہار ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی فراخ دستیاں اور فیض بخشیاں یوں تو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھیں‘ لیکن رمضان کا مہینا تو گویا آپ کے جود و کرم کا موسم بہار ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ، وَكَانَ أَجْوَدُ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ [متفق عليه]

’’نبی کریم ﷺ یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے‘ لیکن رمضان میں تو گویا آپ سراپا جود و کرم ہی بن جاتے۔‘‘

قرآنِ مجید سے مناسبت

قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ روزے کی حالت میں بہت سے دنیاوی مشاغل کا بوجھ روزہ دار کے اوپر سے اترا ہوا ہوتا ہے اور نفس کے میلانات و رجحانات میں‘ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں‘ روزے کے سبب سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ خاموشی‘ خلوت‘ غیر ضروری مصروفیتوں سے علیحدگی اور ترک و انقطاع کی ایک مخصوص زندگی‘ جو روزہ دار کو حاصل ہوتی ہے‘ قرآن کی تلاوت اور اس کے تدبر کے لیے کچھ خاص موزونیت رکھتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی آں حضرت ﷺ پر اس وقت اُتاری جب آپ غارِ حرا میں معتکف تھے۔ نیز قرآن مجید کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مبارک مہینے کو منتخب فرمایا اور اس نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس پورے مہینے میں روزے رکھنا اُمت پر فرض قرار دیا۔ بعض احادیث میں وارد ہے کہ رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر شب میں آں حضرت ﷺ کے ساتھ قراءتِ قرآن مجید کا مذاکرہ کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے اور جتنا قرآن مجید نازل ہو چکا ہوا ہوتا تھا‘ اس کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ رمضان کی راتوں میں تراویح میں قرآن کے سننے اور سنانے کی جو اہمیت ہے‘ وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ قرآن مجید کو روزوں سے اور روزوں کو قرآن مجید سے گہری مناسبت ہے۔

تبتّل اِلی اللہ

روزے کی اصل غایت دل‘ دماغ‘ جسم اور روح سب کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا

ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں تبتّل الی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مقام آدمی کو روزے سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کو حاصل کرنے کے لیے روزے کے ساتھ اعتکاف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اعتکاف اگرچہ ہر شخص کے لیے رمضان کے روزوں کی طرح ضروری چیز نہیں ہے بلکہ یہ اختیاری عبادت ہے لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر رمضان کے آخری عشرہ میں‘ جب کہ روح میں تجرد و انقطاع اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ایک خاص کیفیت و حالت پیدا ہو جاتی ہے‘ آدمی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو اس سے روزے کا جو اصل مقصود ہے‘ وہ کمال درجہ حاصل ہوتا ہے۔ آں حضرت ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں جو اہتمام فرماتے تھے‘ اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح فرماتی ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ، أَحْيَا اللَّيْلَ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ، وَجَدَّ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ [متفق عليه]

’’جب رمضان کا آخری عشرہ آتا‘ آں حضرت ﷺ شب بیداری فرماتے‘ اپنے اہل وعیال کو بھی شب بیداری کے لیے اٹھاتے اور کمر کس کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے۔‘‘

روزے کی آفات اور ان کا علاج

روزے کی برکات میں سے یہ چند برکات ہم نے بیان کی ہیں‘ لیکن یہ برکتیں اس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جب آدمی اپنے روزے کو ان تمام آفتوں سے محفوظ رکھ سکے جو روزے کو خراب کر دینے والی ہیں۔ یہ آفتیں چھوٹی اور بڑی بہت سی ہیں۔ ہم تزکیۂ نفس کے طالبوں کی واقفیت کے لیے یہاں چند بڑی آفتوں کا ذکر کریں گے اور ساتھ ہی ان کے وہ علاج بھی بتلائیں گے جو قرآن اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں‘ تاکہ جو لوگ اپنے روزوں کی حفاظت کرنا چاہیں‘ ان سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

لذّتوں اور چٹخاروں کا شوق

روزے کی عبادت‘ جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے‘ اس لیے مقرر کی گئی کہ آدمی اپنی خواہشوں پر قابو پا سکے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب آدمی اس مقصد کو

روزوں میں ملحوظ رکھے اور ان رغبتوں کو حتی الامکان دبائے جن کے آگے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اکثر بے بس ہو جایا کرتا ہے' اور یہ بے بسی اس کو بہت سی اخلاقی اور شرعی کمزوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے' لیکن بہت سے لوگ اس مقصد کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک روزے کا مہینا خاص کھانے پینے کا مہینا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کھانے پینے پر جتنا بھی خرچ کیا جائے' خدا کے ہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اگر خوش قسمتی سے کچھ خوش حال بھی ہوتے ہیں تو پھر فی الواقع ان کے لیے روزوں کا مہینا کام و دہن کی لذتوں سے متمتع ہونے کا موسم بہار ہی بن کر آتا ہے۔ وہ روزے کی پیدا کی ہوئی بھوک اور پیاس کو نفس کشی کے بجائے نفس پروری کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ وہ صبح سے شام تک طرح طرح کے پکوانوں کے پروگرام بنانے اور ان کے تیار کرانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اور افطار سے سحر تک اپنی زبان اور اپنے پیٹ کی تواضع میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ میں ایک ایسے بزرگ سے واقف ہوں جو ایک دین دار آدمی تھے لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ رمضان کا مہینا کھانے پینے کا خاص مہینا ہے۔ چنانچہ اس نظریے کے تحت وہ رمضان کے مہینے کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کا اہتمام بہت پہلے سے شروع کر دیتے تاکہ رمضان میں ان کے تنوعات سے متمتع ہو سکیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ کھانے پینے کے شوق کو اُکسا دیتا ہے لیکن روزے کا مقصود اسی اکساہٹ کو دبانا ہے نہ کہ اس کی پرورش کرنا۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوتِ کار کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیئے تو ضرور لیکن ہرگز کھانے پینے کو اپنی زندگی کا موضوع نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی خاص سرگرمی اور بغیر کسی خاص اہتمام کے میسر آ جائے' اس کو صبر اور شکر کے ساتھ کھا لے۔ اگر کوئی چیز پسند کے خلاف سامنے آئے تو اس پر بھی گھر والوں پر غصے کا اظہار نہ کرے۔ اگر کسی کو خدا نے فراغت و خوش حالی دی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خود اپنے کھانے پینے پر اسراف کرنے کے بجائے غریب اور مسکین روزہ داروں کی مدد اور ان کو کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ اس چیز سے اس کے روزے کی روحانیت اور برکت میں بڑا اضافہ ہوگا۔ رمضان میں نبی کریم ﷺ کی فیاضی کا جو حال ہوتا تھا' اس کے متعلق ایک حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ روزہ افطار کرانے کے ثواب سے متعلق ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ زید بن خالد جہنی ؓ نبی

اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ غَيْرَ أَنَّهُ لَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِ الصَّائِمِ شَيْئًا)) [سنن الترمذی: ۸۰۷]

''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا' اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے' اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔''

اشتعالِ طبیعت

آدمی جب بھوکا پیاسا ہو تو قاعدہ ہے کہ اس کا غصہ بڑھ جایا کرتا ہے۔ جہاں کوئی بات ذرا بھی اس کے مزاج کے خلاف ہوئی فوراً اس کو غصہ آ جاتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے یہ چیز بھی ہے کہ جن کی طبیعتوں میں غصہ زیادہ ہو وہ روزے کے ذریعہ سے اپنی طبیعتوں کی اصلاح کریں' لیکن یہ اصلاح اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب آدمی روزے کو اپنی طبیعت کی اس خرابی کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اگر وہ اس کو اپنی طبیعت کی اصلاح کا ذریعہ نہ بنائے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ روزہ اس پہلو سے اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے الٹا مضر ہو جائے' یعنی اس کی طبیعت کا اشتعال کچھ اور زیادہ ترقی کر جائے۔ جو شخص اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو یا کوئی دوسرا اس کے اندر اس اشتعال کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اس بات کو یاد کرے کہ اَنَا صَائِمٌ (میں روزے سے ہوں) اور یہ چیز روزے کے مقصد کے بالکل منافی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کو غصہ پر قابو پانے کی تربیت ملتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تربیت اس کے مزاج کو بالکل بدل دیتی ہے' یہاں تک کہ اس کو اپنے غصے پر اس حد تک قابو حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ وہیں استعمال کرتا ہے جہاں وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔

بہت سے لوگ اسلام کے بتائے ہوئے اس اصول کے بالکل خلاف روزے کو سپر کے بجائے تلوار کے طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جاتے ہیں' یعنی روزہ ان کے لیے ضبطِ نفس کے بجائے اشتعالِ نفس کا بہانہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ بیوی پر' بچوں پر' نوکروں پر' ماتحتوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے ہیں' صلواتیں سناتے ہیں' گالیاں بکتے ہیں اور بعض حالات میں مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پھر اپنے آپ کو اس خیال سے تسلی دے لیتے ہیں کہ کیا کریں'

روزے میں ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

جو لوگ اپنے نفس کو اس راہ پر ڈال دیتے ہیں‘ ان کے لیے روزہ اصلاحِ نفس کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کے بگڑے ہوئے نفس کو بگاڑنے کا مزید سبب بن جایا کرتا ہے۔ جو روزہ بھی وہ رکھتے ہیں وہ ان کا نفس مشتعل کرنے کے لیے چابک کا کام دیتا ہے جس سے ان کا نفس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص روزے کی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے‘ اسے چاہیے کہ وہ روزے کو اپنے نفس کے لیے ایک لگام کے طور پر استعمال کرے اور ہر اشتعال دلانے والی بات کو اسی سپر پر روکے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزے کے احترام کا یہ احساس طبیعت پر غالب رہے تو آدمی بڑی سے بڑی ناگوار بات بھی برداشت کر جاتا ہے اور اس پر کوئی احساس کمتری طاری نہیں ہوتا۔ اس طرح کی آزمائش کے جتنے مواقع اس کے سامنے آتے ہیں وہ ہر موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان پر ایک فتح حاصل کی ہے اور اس فتح کا احساس اس کے غصہ کو ایک راحت واطمینان کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت

روزے کی ایک عام آفت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جن کے ذہن کی تربیت نہیں ہوئی ہوتی ہے‘ کھانے پینے اور زندگی کی بعض دوسری دلچسپیوں سے علیحدگی کو ایک محرومی سمجھتے ہیں اور اس محرومی کے سبب سے ان کے لیے دن کاٹنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس مشکل کا حل وہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ بعض ایسی دلچسپیاں تلاش کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں روزے کے مقصد کے منافی نہیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ تاش کھیلتے ہیں‘ ناول‘ ڈرامے اور افسانے پڑھتے ہیں‘ ریڈیو پر گانے سنتے ہیں‘ دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور بعض من چلے سینما کے ایک آدھ شو دیکھ آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں خیال کرتے۔ ان سب سے زیادہ سہل الحصول دلچسپی بعض لوگ یہ پیدا کر لیتے ہیں کہ اگر ایک دو ساتھی میسر آ جائیں تو کسی کی غیبت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ روزے کی بھوک میں آدمی کا گوشت بڑا لذیذ معلوم ہوتا ہے اور تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزہ رکھ کر آدمی کو یہ لذیذ مشغلہ مل جائے تو آدمی جھوٹ‘ غیبت‘ ہجو اور اس قسم کی دوسری آفتوں کا جن کو حدیث میں ”حصائد اللّسان“ (زبان کی کھیتیاں) سے تعبیر کیا گیا ہے‘ ایک انبار لگا دیتا ہے اور اسی مشغلہ میں صبح سے شام کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں

آدمی کے روزے کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کے ضروری آداب میں سے سمجھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پچھلے مذاہب میں چپ رہنا بھی روزے کی شرائط میں داخل تھا۔ چنانچہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم سلامٌ علیہا روزے کی حالت میں صرف اشارہ سے بات کرتی تھیں۔ اسلام نے روزہ داروں پر یہ پابندی تو عائد نہیں کی ہے لیکن اس پابندی کے نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی روزے میں اپنی زبان کو چھوٹ دے دے‘ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ضروری اور مفید بات کرنے کا موقع پیش آ جائے تو کر لے‘ ورنہ خاموش رہے۔ جو شخص ہر قسم کی اناپ شناپ اور جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا رہتا ہے‘ حدیث شریف میں آیا ہے کہ پھر اس کا محض کھانا پینا چھوڑ دینا اللہ کے نزدیک ایک بالکل بے نتیجہ کام ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ)) [صحیح البخاری:۱۹۰۳]

”جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔“

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی کا جو وقت گھر کے کام کاج اور معاش کی مصروفیتوں سے فاضل بچے اس کو مفید چیزوں کے مطالعہ میں صرف کرے۔ روزے کے دنوں کے لیے قرآن شریف‘ حدیث‘ سیرتِ نبوی‘ سیرتِ صحابہؓ اور تزکیۂ نفس کی کتابوں کے مطالعے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنا لے۔ خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے تدبّر پر‘ پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف کرے۔ قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ‘ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے‘ ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر روزہ دار کو ان برکتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن مجید اور ماثور دعاؤں کے یاد کرنے کے لیے بھی آدمی کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالے۔ اس طرح قرآن مجید اور مسنون دعاؤں کا آدمی کے پاس آہستہ آہستہ ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے‘ جو آدمی کے جمع کیے ہوئے مال واسباب کے ذخیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

ریا

ریا کا فتنہ جس طرح تمام عبادتوں کے ساتھ لگا ہوا ہے‘ اسی طرح روزے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ روزے تو رکھتے ہیں‘ بالخصوص رمضان کے روزے‘ لیکن ہوسکتا ہے کہ ان میں بہت کچھ دخل اس احساس کو بھی ہو کہ روزے نہ رکھے تو پاس پڑوس کے روزہ داروں میں نکو بننا پڑے گا‘ یا لوگوں میں جو دین داری کا بھرم ہے وہ جاتا رہے گا‘ یا اپنے گھر اور خاندان والے ہی برا مانیں گے۔ اس طرح کے مختلف احساسات ہیں جو رمضان کے روزوں میں شریک بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ خلوصِ نیت آلودہ اور مشتبہ ہو جایا کرتا ہے جو روزے کی حقیقی برکتوں کے ظہور کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ جس بندے میں خدا کی خوشنودی کے سوا کوئی اور محرک شریک ہوجائے‘ یہ روزہ وہ روزہ نہیں ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ’’بندہ میرے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت چھوڑتا ہے‘ روزہ میرے لیے ہے اور مَیں ہی اس کا بدلہ دوں گا‘‘ بلکہ یہ روزہ اسی غرض کے لیے ہوجائے گا جس غرض کے لیے رکھا گیا ہے۔

اس آفت کا اوّل علاج تو یہ ہے کہ آدمی اپنی نیت کو ہر دوسرے شائبہ سے حتی الامکان پاک کرنے کی کوشش کرے۔ اسے ہر روز یہ سوچنا چاہیے کہ اپنے روزے کو تمام برکتوں سے محروم کر کے فاقہ کے درجے میں ڈال دینا انتہائی نادانی ہے۔ آخر یہ مشقت اٹھانے کا حاصل کیا ہوا جب کہ یہ دنیا میں بھی موجب کلفت اور آخرت میں بھی موجب وبال بنے؟ اس طرح نفس کے سامنے بار بار روزے کی قدر و قیمت واضح کرنی چاہیے تاکہ اس کی نگاہ دوسروں کی طرف سے ہٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہو۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی رکھے اور اس میں دو باتوں کا اہتمام کرے: ایک حتی الامکان اخفا کا‘ یعنی ان کا اشتہار دینے کی کوشش نہ کرے۔ دوسرے اعتدال یا میانہ روی کا‘ یعنی نفلی روزے اسی حد تک رکھے جس حد تک خواہشات و شہوات کو حالت اعتدال پر لانے کے لیے ان کی ضرورت ہو۔ اگر اس حد سے آدمی بڑھ جائے گا تو وہ چیز خود بھی ایک فتنہ ہے اور اسلام نے اس سے بھی بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے۔ روزے کی حیثیت ایک دوا کی ہے‘ وہ اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کرلی جائے تو بسا اوقات یہ خود بھی ایک بیماری بن جاتی ہے۔ (میثاق: جون ۱۹۵۹ء) ❁❁❁

منبعِ نور کی بازیافت

ریان بن نعمان

روشنی کی ضرورت کیوں؟

اندھیرے روشنی کی ضرورت کو جنم دیتے ہیں۔ یہ اندھیرے جتنے شدید اور گھٹاٹوپ ہوں گے‘ ظلمات کے یہ پردے جتنے دبیز ہوں گے‘ یہ تاریکیاں جتنی مہیب ہوں گی‘ بے قرار آنکھیں اتنی ہی شدت سے روشنی کی کرن کرن کو ترسیں گی۔ بے چین نفوس اتنی ہی بے چینی سے نور کے منتظر ہوں گے۔ مضطرب اذہان اتنے ہی انہماک کے ساتھ حصولِ ضیاء کی تدابیر میں مصروفِ عمل ہوں گے۔ بحالتِ مراقبہ‘ ذرا بے قراری کی اس کیفیت کو طاری کر کے تو دیکھیے کہ جب قلوب کی بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ جائے مگر نورانیت سے محروم رہے‘ مضطرب اذہان عقل وخرد کی معلوم وادیوں کو طے کرلیں مگر ع ’’درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی‘‘ کے مصداق کوئی سراغِ راہ ملنا تو درکنار تشنگی میں اضافے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ بے قرار آنکھوں سے نمکیات خشک ہوجائیں مگر منبعِ نور کی بازیافت تو کجا روشنی کی ایک کرن بھی میسر نہ آسکے!

قہرِ ظلمات میں گھرا انسانی معاشرہ

ذرا اس معاشرے کے ظروف و احوال بھی ملاحظہ فرمالیں کہ جس کی آغوش میں یہ نفوسِ قدسیہ آنکھ کھولتے ہیں۔ ہر قسم کے اندھیرے اور ہر نوع کی ظلمانیت میں گھر کر‘ انسانی اقدار سے گر کر‘ حیوانیت سے بھی پست سطح پر زندگی گزارنے والا متعفن معاشرہ کہ جہاں اندھیروں نے روشنی کی ضرورت کے احساس کو ہی دل سے ختم کر دیا ہو۔ پھر ﴿ظُلُمٰتٌ ۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ﴾ (النور:۴۰) کے مثل قول و عمل کے اندھیروں پر مستزاد نظر و فکر کی کالک بھی ہر قسم کی نورانیت کی معدومیت پر دال ہو تو اخراج من الظلمات الی النّور کے لیے معمولی ضیاء کافی نہیں بلکہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کی شدید احتیاج ہوگی۔ جن نفوسِ قدسیہ کی یہ قابلِ رحم حالت ہو‘ ذرا بوجھیے تو سہی

ان کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہوگی؟ ان کی اس بے قراری کو قرار کیسے ملے گا؟ ان کے اس درد کا آخر کیا درماں ہوگا؟ کیا انتہائی معاشی آسودگی یا مروّجہ سیاسی استحکام؟ آزاد معاشرتی مساوات یا بے مثال سائنسی ترقی؟ نہیں نہیں‘ بالکل نہیں! یہ کون سی فراست ہے کہ مرض غیر مادّی ہو اور علاج مادّی؟ درد اندرونی ہو اور درماں بیرونی؟ تکلیف و تریاق میں یہ بُعد المشرقین عقلِ سلیم کے ہاں ناقابلِ قبول ہے۔

وادیٔ ظلمات میں جلوۂ آفتابِ ہدایت

ان پاکیزہ نفوس کے لیے‘ کہ جن کی فطرت سلیم اور عقل صحیح ہے‘ اس پُر وحشت معاشرے میں گزران کس قدر اجیرن ہوگا! بقول جگر مرادآبادی ؎

کس طرف جاؤں‘ کدھر دیکھوں‘ کسے آواز دُوں ؟
اے ہجومِ نامُرادی‘ جی بہت گھبرائے ہے!

اس پُر ہیبت معاشرے کی سعید ارواح ابھی اسی گھبراہٹ میں مبتلا تھیں کہ تقدیر کو انسانیت پر رحم آ ہی گیا۔ اگرچہ نور و ظلمات برابر نہیں‘ مگر خالقِ نور و ظلمات تو ایک ہی ہے۔ چنانچہ ع ”علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی“ کی مانند تڑپتے دلوں کا سرور‘ مضطرب اذہان کا مداوا‘ متلاش آنکھوں کا قرار‘ منتظر ارواح کا منتظر وادیٔ فاران کے جبلِ نور سے منبعِ نور سمیت ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

کی مانند بغرضِ دفعِ ظلمات آن وارد ہوا۔ ﴿وَالشَّمۡسِ وَضُحٰىهَا ۝۱﴾ (الشمس) ”قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی“ کے مصداق وادیٔ ظلمات میں آفتابِ ہدایت طلوع ہوا۔ اس نور کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کریں تو معرفتِ الٰہی اس کا اہم ترین اور مرکزی جزو ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ (النور: ۳۵) ”اللہ نُور ہے آسمانوں اور زمین کا۔“ قرآنِ مجید اس نور کا اہم حصہ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا ۝۱۷۴﴾ (النساء) ”اے لوگو! آ چکی ہے تمہارے پاس ایک برہان تمہارے ربّ کی طرف سے‘ اور ہم نے تمہاری طرف روشن نُور نازل کر دیا ہے“۔ اس نور کے قاصد رسولِ ملک جو بذاتِ خود نورانی مخلوق‘ اس نور کو موصول کرنے والے رسولِ بشر ﷺ

جو نورانیت (بمعنی روحانیت) کی معراجِ کامل۔ ان اجزاء اور ان پر مستزاد نورِ فطرت و نورِ عقل کی مدد سے جسمِ انسانی کے مادّی غلاف میں محصور ملکوتی چنگاری یعنی روحِ ربانی کی بازیابی! یہ سب اسی نوری و نورانی رابطے کی وہ پُرنور کڑیاں ہیں جو قعرِ ظلمات میں پڑی انسانیت بالخصوص عقل و خرد کی صحرائی وادیوں میں بھٹکتے اور مختلف سرابوں کی طرف لپکتے نفوسِ قدسیہ کے لیے آبِ حیات ثابت ہوئیں۔ نورِ مجسم‘ نور الوریٰ‘ سرورِ کائنات‘ رحمۃٌ للعالمین‘ محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد کے ساتھ ظلمت کی ہر صورت پر نورِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے معدومیت کی مہر لگی۔

رحمت: مفہوم-احتیاج-مظہر

رحمت کے مفہوم میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ جس نعمت کی جس وقت احتیاج ہو‘ وہ میسر آ جائے۔ نوعِ انسانی کو جس نعمت کی سب سے زیادہ احتیاج تھی‘ ہے اور رہے گی‘ وہ ہے نعمتِ ہدایت۔ اندھیروں سے روشنی کی طرف ہدایت‘ گمراہیوں سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت‘ قدم قدم پر ہدایت‘ آخری دم تک ہدایت۔ یہی ہر نعمت کو رحمت بناتی ہے‘ وگرنہ انسان نعمتوں کے صحیح استعمال سے لاعلم رہ کر انہیں اپنے لیے زحمت بنا بیٹھتا ہے۔ چنانچہ الرحمٰن ذات کی رحمانیت کا سب سے بڑا مظہر بھٹکتی انسانیت کو منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین یعنی قرآنِ حکیم کا بذریعہ امام الانبیاء‘ آقائے دو جہاں ﷺ عطا کیا جانا ہے۔ قرآنِ مجید اگر الھدیٰ ہے تو نبی اکرم ﷺ الہادی‘ فرقانِ حمید اگر رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ہے تو ذاتِ محمدی ﷺ رَحۡمَةٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ‘ کتاب اللہ اگر شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ہے تو نبی مکرم ﷺ مزکّیٔ اعظم۔ گویا کلام اللہ اگر منبعِ نورِ ہدایت ہے تو حبیب اللہ ﷺ کی شان یہ ہے: ﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۶۴، الجمعۃ: ۲) ”جو انہیں اس (اللہ) کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔“ اور ((کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ)) (صحیح مسلم) ”آپؐ کا اخلاق تو سراسر قرآن تھا“ کے مصداق اس کی نورانیت سے متعارف و مستفیض کرانے والے قرآنِ حکیم کی مجسّم تفسیر۔ غرض آفتابِ ہدایت کی تمازت بھی آفاقی ہے اور یہ آفتاب جس افق پر طلوع ہوا اس کی فیوضات بھی ابدی۔ تجلیاتِ الٰہی کے یہ دونوں مظاہر یعنی قرآن و صاحبِ قرآن ﷺ جب تجلیاتِ نبوت کی صورت میں عالمِ انسانیت پر منعکس ہوئے تو جہاں دل کی دنیا منور ہوئی‘ تاریکیوں کے بادل چھٹے‘ نظر و فکر کی کالک رفع ہوئی اور جہاں حسد

بغض، طمع، لالچ، شہوت پرستی، عجب، حُبِّ دنیا، ریب و تشکیک، غرض اوصافِ رزیلہ کی تمام صورتیں دل کی دنیا سے رفع ہوئیں وہیں ان باطنی امراض کے خارجی مظاہر یعنی کفر، شرک، الحاد و مادّہ پرستی، قتل و غارت، فحاشی و عریانی، دھوکا دہی و لوٹ مار، انتشار و افتراق، بدسلوکی و بداخلاقی، اسراف و تبذیر، قطع رحمی، ظلم و جور، فکری آوارگی و بےعملی غرض اخلاقی انحطاط کی تمام صورتوں کی عملاً نفی ہوگئی۔ نورِ مصطفیٰ ﷺ سے جہاں قلوب محبت و مودّت، نرمی و شفقت، خوف و رَجا، علم و حلم، شائستگی و لطافت، خشیت و انابت، توحید و یقین، رحم و کرم، ایثار و قربانی، روحانی تسکین و فکرِ آخرت، شرم و حیا جیسے اوصافِ حسنہ سے مزین ہوئے وہیں ان باطنی فضائل کے خارجی مظاہر یعنی حسن سلوک و خوش اخلاقی، ادب و احترام، عدل و انصاف، امن و سکون، اتحاد و اتفاق، اخوت و مساوات، عفو و درگزر، میانہ روی و صلہ رحمی سے ایک مثالی و خوش گوار معاشرہ وجود میں آیا۔

منبعِ نور سے استفادہ: تین طرزِ عمل

چراغِ مصطفوی ﷺ کے بھڑکنے سے تین طرزِ عمل وجود میں آئے۔ کچھ سعید ارواح تو وہ تھیں جو ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ﴾ (النور:۳۵) ''قریب ہے کہ اُس کا روغن (خود بخود) روشن ہو جائے، چاہے اُسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو'' کے احوالِ باطنی کے ساتھ اس منبعِ نور کی جانب پروانوں کی طرح یوں لپکیں کہ ان کی بقا و فنا کا حصار ہی اس ہالۂ نور کے گرد کھنچ گیا۔ کچھ شقی قلوب وہ تھے جو:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ (البقرۃ)

''ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی، پھر جب اس آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا، انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں پس یہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔''

اور ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ﴾ ''اندھیرے ہیں ایک پر ایک'' کے مثل فکر و عمل کے ظاہری و باطنی اندھیروں کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے پر مصر رہے۔ چنانچہ بذریعہ بارانِ انوارِ الٰہی، روحانی آلائشات کی تطہیر کے حسین تجربے، نیز قلب میں عشقِ حقیقی کی آگ بھڑکنے کے نتیجے میں

پیدا ہونے والی لذت و حلاوتِ ایمانی سے یکسر محروم رہے۔ وہیں کچھ بدنصیب وہ تھے جو تجلیاتِ الٰہی، ذاتِ محمدی ﷺ اور انوارِ قرآنی کے ہالۂ نور میں آن وارد تو ہوئے مگر جب معلوم ہوا کہ یہاں تو بجلی کی کڑک بھی ہے اور بادلوں کی گرج بھی، نیز آفتابِ ہدایت سے استفادہ اس کی تمازت جھیلنے کے ساتھ مشروط ہے تو خام دل ٹھٹک کر رہ گئے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے!

اور ع

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں، دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

کے مصداق متذبذب رہے کہ آیا وادیٔ نور میں قدم رکھیں کہ جہاں انفاقِ مال و بذلِ نفس کی کٹھن راہیں ہیں، ایثار و قربانی کے پُرصعوبت مراحل ہیں، صبر و مصابرت کے جاں گسل لمحات ہیں، یا کفرِ حقیقی ہی کی تاریکی میں مستغرق رہیں کہ جہاں جان کو بھی تحفظ حاصل ہے اور مال کو بھی دوام، نہ راستہ مشکل ہے اور نہ سفر دشوار۔ مقدم الذکر کُفّار کہلائے اور مؤخر الذکر منافقین۔ یہ دونوں ہی عناصر نہ صرف خود انوارِ ایمانی سے محروم رہے، ستم بالائے ستم یہ کہ اس منبعِ نور کو بجھانے ہی کے درپے ہو گئے۔ کوئی مخالف تدبیر ایسی نہ تھی جو انہوں نے چھوڑی ہو، کوئی موقعِ حزن ایسا نہ تھا جو انہوں نے ضائع کیا ہو، کوئی طرزِ ملامت ایسی نہ تھی جو انہوں نے اپنائی نہ ہو۔ غرض دن ہو یا رات، انفرادیت ہو یا اجتماعیت، کوئی صورت حال انہیں منبعِ نور اور اس کے پروانوں کے خلاف محاذ آرائی سے مانع نہ ہوئی۔ ہائے کیا بدنصیبی ہے، کیا ہی بدبختی ہے کہ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ماحول کو منور کر رہی ہیں مگر مردہ دل اس کی حرارت کو جذب کرنے سے قاصر ہیں۔ یاللعجب! بقول قائم چاند پوری۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

اُن کی اِن تمام مساعیٔ رزیلہ کو ربّ کائنات نے منہ کی پھونکوں سے تشبیہ دی ہے کہ جو اس کاروانِ نور کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی: ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ

إِلَّآ أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾ (التوبۃ) ''وہ تلے ہوئے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کا اِتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ بقول مولانا ظفر علی خان ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

تیسرا گروہ شمعِ رسالت کے اُن پروانوں کا ہے جو نورِ ایمان سے منور ہو کر اِتمامِ نورِ الٰہی کے عظیم مشن میں سربکف ہیں۔ یعنی غلبۂ دینِ حق کے مشن میں، عالَمِ دنیا کو ظلم و جور اور کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر عدل و قسط اور ایمان و ایقان کی روشنی سے منور کرنے کے مشن میں، تا آنکہ سرزمینِ عرب نے ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط﴾ (بنی اسرائیل:۸۱) ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا'' کا پُرکیف منظر بھی دیکھا۔ احقاقِ حق وابطالِ باطل یا بالفاظِ دیگر اِتمامِ نور کا یہ پُرخطر اور کٹھن کارِ عظیم ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی!

اور ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

کے مصداق عالمی غلبۂ اسلام کی صورت میں منتج ہونا تھا، اور ہونا ہے۔ لہٰذا عالَمِ ظاہر سے شمعِ رسالت کے گُل ہو جانے کے بعد نورِ حق کے یہ متوالے ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ (الاعراف:۱۵۷) ''تو وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لائیں اور ان کی تعظیم کریں اور ان کی مدد کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا'' پر عمل درآمد کرتے ہوئے اور آفتابِ ہدایت سے اپنے اٹوٹ تعلق کو نبھاتے ہوئے روئے ارضی کے اطراف و اکناف میں مشنِ رسالت کو لے کر اس نعرے کے ساتھ پھیل گئے:

إِنَّ اللّٰهَ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَمِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا إِلَى سَعَةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ

''بے شک اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم جسے وہ چاہے، بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ

کی بندگی میں لے آئیں، اور دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعت میں داخل کریں، اور باطل مذاہب کے ظلم سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں۔''

زمین ختم ہوگئی مگر جذبۂ جہاد ختم نہ ہو سکا۔ زندگیوں کے چراغ گُل ہوئے اس حال میں کہ شوقِ شہادت تلاطم خیز موجوں کی مانند دلوں میں ٹھاٹے مار رہا تھا۔ خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ پروانے شمعِ رسالت کے گرد جمع تھے، جن میں سے نورِ حق کے صرف دس ہزار متوالے شہر نور میں سپردِ خاک ہوئے۔ روئے ارضی کے مختلف حصّوں میں واقع صحابہ کرام ﷡ کی قبور جہانِ رنگ و بو میں منبعِ نور کے تعارف و اشاعت اور دفعِ ظلمات کے نبوی مشن میں اپنی زندگی لٹا دینے پر دال ہیں۔

چراغِ مصطفویؐ بمقابلہ شرارِ بولہبی

نور و ظلمات کی اس تمثیل کا اطلاق فقط ساڑھے چودہ سو سال قبل کے معاشرے پر نہ کیا جائے بلکہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

کے مصداق یہ زندہ تصویر ہر دور کی ہے۔ ہر اگلا زمانہ پچھلے زمن پر اندھیروں کی نت نئی صورتوں کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ پھر چاہے اندھیرا افکار و نظریات کا ہو یا اعمال و اطوار کا، انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی سے، ہر دو قسم کی ظلمتوں کے ازالے کے لیے اسی منبعِ نور کی جانب مواجہت ناگزیر ہوگی۔ ؎

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ است!

''دُنیائے رنگ و بو میں جہاں بھی نظر دوڑائیں، اس کی مٹی سے جو بھی آرزو پیدا ہوتی ہے وہ یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مستعار ہے یا ابھی تک نورِ مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں ہے۔''

(باقی صفحہ 118 پر)

امتحان و آزمائش

شیخ ابوکلیم مقصود الحسن الفیضی

ایک انسان خصوصاً ایک مؤمن کی زندگی سراپا امتحان ہے‘ بلکہ اس کی پیدائش کا مقصد بھی امتحان ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾﴾ (الملک)

’’جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے‘ اور وہ غالب (اور) بخشنے والا ہے۔‘‘

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن گوناگوں نعمتوں سے نوازا ہے وہ بھی درحقیقت ہمارے لیے محض آزمائش ہیں۔ سورۃ الکہف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾﴾

’’جو کچھ زمین پر موجود ہے‘ اُسے ہم نے اس کی زینت بنایا ہے‘ تاکہ ہم آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔‘‘

یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک مؤمن کی زندگی اول تا آخر امتحان ہی امتحان ہے‘ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ بہت کم لوگ اس امتحان میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو یہ تصور بھی نہیں رہتا کہ وہ کسی امتحان سے گزر رہے ہیں۔ آج ہمارا حال بعینہٖ یہی ہے‘ جس کا ذکر حضرت سلمان فارسی ؓ کے اس فرمان میں موجود ہے۔

حضرت عبدالرحمان بن سعیدؒ بیان کرتے ہیں کہ مَیں حضرت سلمان فارسی ؓ کے ساتھ تھا‘ جب وہ ’’کندہ‘‘ نامی گاؤں کے ایک شخص کی عیادت کو گئے۔ جب مریض کے پاس پہنچے تو اسے خوشخبری سنائی کہ ’’مؤمن بندہ جب بیمار ہوتا ہے تو یہ بیماری اس کے لیے گناہوں کا کفّارہ

اور مستقبل میں خبردار کرنے کا سبب بنتی ہے‘ اور اگر فاجر بندہ بیمار ہوتا ہے‘ تو اس کی مثال اس اونٹ کی طرح ہے جسے اس کے مالکوں نے باندھ دیا اور پھر کھول دیا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ کیوں اسے باندھا گیا اور کیوں کھولا گیا۔‘‘(۱)

امتحان و آزمائش کے سلسلے میں چند گزارشات لائقِ توجہ ہیں:

اوّلاً: ابتلاء و آزمائش ایک لازمی امر ہے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور ہم ضرور بالضرور تمہیں خوف و فاقہ میں مبتلا کر کے‘ نیز جان و مال اور پھلوں کے خسارے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے‘ اور (اے نبی ﷺ) ایسے صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں‘ کہ جب انہیں کوئی مصیبت آئے تو فوراً کہہ اُٹھتے ہیں: ہم خود بھی اللہ کی ملکیت ہیں‘ اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تاکید کے تین الفاظ: واوِ قسم‘ لام تاکید اور نون تاکید کے ذریعے‘ مسلمانوں کو خبردار کیا کہ تمہیں اس دنیا میں پانچ قسم کے مصائب سے آزمایا جائے گا: (۱) خوف‘ (۲) فاقہ‘ (۳) جان یعنی افراد کی کمی‘ (۴) مال و اسباب کی کمی‘ (۵) پھلوں اور کھیتی میں کمی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾﴾ (آل عمران)

’’(مسلمانو!) تمہیں اپنے اموال اور اپنی جانوں میں آزمائش آ کر رہے گی‘ نیز تمہیں ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے تھے اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سننا ہوں گی۔ اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو یہ بلاشبہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔‘‘

ثانیاً: ابتلاء و آزمائش اللہ کا نظام ہے

ہم سے پہلے بھی جتنے لوگ گزرے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی آزمایا ہے۔ سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿الٓمّٓ ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ② وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِیۡنَ ③﴾

’’الف لام میم۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یہ کہنے سے کہ ’’ہم ایمان لائے‘‘ اُنہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اُن کی آزمائش نہ کی جائے گی؟ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان میں سے سچے کون ہیں اور جھوٹے کون!‘‘

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں (مظالم کا) شکوہ کیا۔ آپ ﷺ خانہ کعبہ کے سائے میں اپنی چادر سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ ہم نے عرض کی: کیا آپ ہمارے لیے مدد طلب نہیں کریں گے یا ہمارے حق میں دعا نہیں کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كَانَ الرَّجُلُ فِيمَنْ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُ لَهُ فِي الْأَرْضِ، فَيُجْعَلُ فِيهِ، فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيُشَقُّ بِاثْنَتَيْنِ، وَمَا يَصُدُّهُ ذٰلِكَ عَنْ دِينِهِ، وَيُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لَحْمِهِ مِنْ عَظْمٍ أَوْ عَصَبٍ، وَمَا يَصُدُّهُ ذٰلِكَ عَنْ دِينِهِ، وَاللّٰهِ لَيُتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرَ، حَتّٰى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلٰى حَضْرَمَوْتَ، لَا يَخَافُ إِلَّا اللّٰهَ أَوِ الذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهِ، وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ))[۲]

’’تم سے پہلوں میں تو ایک آدمی کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا، پھر اُسے اس میں گاڑ دیا جاتا، پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کر دیے جاتے۔ یہ اتنی بڑی آزمائش بھی اسے دین سے ہٹا نہ سکتی۔ اور (بعض کے ساتھ ایسا بھی ہوتا کہ) لوہے کی کنگھی سے اس کے گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے الگ کر دیا جاتا، اور یہ سزا بھی اسے دین سے دور نہ کر سکتی۔ قسم بخدا! اللہ اس دین کو لازماً پورا کر کے چھوڑے گا، حتیٰ کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک چلتا جائے گا اور اسے صرف اللہ کا ڈر ہو گا، یا بھیڑیے سے بکریوں کا ڈر ہو گا، البتہ تم جلد بازی کرتے ہو۔‘‘

ثالثاً: آزمائش کیوں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو آزمائش سے دوچار کیوں ہونا پڑتا ہے؟ اس کی متعدد وجوہات قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں۔

(۱) حقیقت کا اظہار: بظاہر ہر انسان اپنے آپ کے حق پر ہونے اور مخلص ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا ثبوت امتحان و آزمائش کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡهِ حَتّٰی یَمِیۡزَ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطۡلِعَكُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَجۡتَبِیۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَكُمۡ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۱۷۹﴾

’’اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اسی حال پر نہ چھوڑے گا جس حال پر تم اس وقت ہو، تا آنکہ وہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ کر دے۔ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے، بلکہ اس کام کے لیے وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا ہے، لہٰذا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اگر تم ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے، تو تمہیں بہت بڑا اجر ملے گا۔‘‘

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰی نَعۡلَمَ الۡمُجٰهِدِیۡنَ مِنۡكُمۡ وَالصّٰبِرِیۡنَ ۙ وَنَبۡلُوَا۟ اَخۡبَارَكُمۡ ۳۱﴾ (محمد)

’’اور (قسم ہے) ہم تم لوگوں کو ضرور بالضرور آزمائیں گے یہاں تک کہ یہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے مجاہد کون ہے، اور تمہارے احوال کی جانچ پڑتال کریں گے۔‘‘

سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا:

﴿اِنۡ یَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَتِلۡكَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَیَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ۱۴۰ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَیَمۡحَقَ الۡكٰفِرِیۡنَ ۱۴۱ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ۱۴۲﴾

’’اگر تمہیں کوئی صدمہ پہنچا ہے تو اس سے پہلے کافروں کو بھی ایسا ہی صدمہ پہنچ چکا ہے، اور یہ (فتح وشکست وغیرہ کے) دن تو ہم لوگوں کے درمیان پھراتے رہتے ہیں، اور اس لیے

بھی کہ اللہ ان لوگوں کو جاننا چاہتا ہے جو سچے دل سے ایمان لائے ہیں اور پھر تمہی لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مقام دینا چاہتا ہے' اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس لیے بھی کہ (اس آزمائش سے) مؤمنوں کو پاک صاف کر کے چھانٹ لے اور کافروں کو ملیامیٹ کر دے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے' جبکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ کو نہیں معلوم کہ تم میں سے جہاد کرنے والے کون ہیں اور صبر کرنے والے کون ہیں۔''

اگر غور کریں تو اس آیت میں آزمائش کی چار حکمتیں بیان ہوئی ہیں:

(ا) ایمان والے بے ایمانوں سے ممتاز ہو جائیں۔

(ب) کچھ لوگوں کو شہادت کا مقام مل جائے۔

(ج) اہلِ ایمان کی تمحیص یعنی ان کے گناہوں کی معافی۔

(د) کافروں کی طاقت پر ضرب کاری' کہ وہ پہلی جیت پر دلیر ہو کر آگے بڑھیں تو مسلمان انہیں کاٹ کر رکھ دیں۔

(۲) جنّت میں داخلے کا سبب: آزمائش کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ جنّت میں داخلے کا سبب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ))(۳)

''جہنّم کو شہوات سے گھیر دیا گیا ہے' اور جنّت کو مشکلات سے گھیر دیا گیا ہے۔''

عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ مجھے عبد اللہ بن عباس ؓ نے بیان کیا کہ کیا میں تمہیں وہ عورت نہ دکھاؤں جو جنتی ہے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! انہوں نے کہا: یہ کالی سی عورت۔ یہ عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کیا: مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے' اور میرا ستر کھل جاتا ہے' آپ میرے حق میں دعا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ، وَإِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يُعَافِيَكِ))
فَقَالَتْ: أَصْبِرُ، فَقَالَتْ: إِنِّي أَتَكَشَّفُ فَادْعُ اللّٰهَ لِي أَنْ لَا أَتَكَشَّفَ، فَدَعَا لَهَا(۴)

''اگر تم چاہو تو صبر کر لو اور تمہارے لیے جنت ہے' اور اگر تم چاہو تو میں اللہ سے دعا کر دوں کہ تمہیں بیماری سے عافیت بخش دے۔ تو اس نے کہا: میں صبر کر لیتی ہوں۔ اس

نے مزید یہ بھی کہا کہ میرا پردہ کھل جاتا ہے' میرے حق میں دعا کریں کہ میرا ستر نہ کھلے۔ تو آپ ﷺ نے اس کے حق میں دعا کی۔''

حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ بخار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: مجھے اپنے پیاروں کے پاس بھیج دیں' تو آپ ﷺ نے بخار کو انصار کی طرف بھیج دیا۔ بخار چھ دن تک انصار کو چڑھتا رہا' تو انہیں اس کی سخت تکلیف ہوئی۔ آپ ﷺ انہیں ملنے ان کے گھروں تک آئے۔ انہوں نے آپ ﷺ سے بخار کی شکایت کی' تو نبی اکرم ﷺ ایک ایک گھر میں گئے۔ ان کے حق میں صحت و عافیت کی دعا کرتے رہے۔ جب آپ ﷺ واپس ہونے لگے تو ایک انصاری عورت پیچھے پیچھے ہو لی' کہنے لگی: جس ذات نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اس کی قسم! میں بھی انصار میں سے ہوں اور میرا باپ بھی انصاری تھا۔ جیسے آپ نے انصار کے لیے دعا کی ہے' میرے لیے بھی دعا کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا شِئْتِ، إِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يُعَافِيَكِ، وَإِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ)) قَالَتْ: بَلْ أَصْبِرُ، وَلَا أَجْعَلُ الْجَنَّةَ خَطَرًا(۵)

''جو تو چاہے۔ اگر تو چاہے تو میں اللہ سے دعا کر دوں کہ وہ تجھے عافیت بخش دے' اگر تو چاہے تو صبر کر لے اور تیرے لیے جنت ہے۔'' کہنے لگی: ''میں صبر کرتی ہوں اور میں جنت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔''

(۳) جہنم سے نجات: آزمائش کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس میں پورا اترنے والوں کو جہنم سے نجات ملے گی۔

((الْحُمَّى حَظُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ مِنَ النَّارِ))(۶)

''بخار ہر مؤمن کے لیے آگ میں سے حصہ ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ایک صحابی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اسے بخار تھا' اور میں بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایسا کرنا آپ ﷺ عیادت کا ایک حصہ تصور کرتے تھے۔ پھر فرمایا:

((أَبْشِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ: هِيَ نَارِي أُسَلِّطُهَا عَلَى عَبْدِي الْمُؤْمِنِ فِي الدُّنْيَا لِتَكُونَ حَظَّهُ مِنَ النَّارِ فِي الْآخِرَةِ))(۷)

''خوش ہو جاؤ' اس لیے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ بخار میری آگ ہے' جسے میں اپنے مؤمن بندے پر مسلط کرتا ہوں' تاکہ اس کے لیے جہنم کے حصے کا بدل بن جائے۔''

(۴) گناہوں کی معافی: آزمائش کا ایک بڑا اہم فائدہ بندوں کی ان لغزشات اور گناہوں کا کفارہ ہے جو اُن سے دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَةِ فِيْ نَفْسِهِ وَوَلَدِهِ وَمَالِهِ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ تَعَالٰى وَمَا عَلَيْهِ خَطِيْئَةٌ))(۸)

''مؤمن مرد یا عورت کو تکلیف پہنچتی رہتی ہے' کبھی اس کے جسم میں' کبھی اولاد میں' اور کبھی مال میں' یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا (یعنی اس کی موت واقع ہو جاتی) ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں رہتا۔''

حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپ فرما رہے تھے:

((مَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ وَصَبٍ وَلاَ نَصَبٍ وَلاَ سَقَمٍ وَلاَ حَزَنٍ، حَتَّى الْهَمِّ يُهَمُّهُ، إِلَّا كُفِّرَ بِهِ مِنْ سَيِّئَاتِهِ))(۹)

''مؤمن کو جو تکلیف پہنچتی ہے' جو تھکان لاحق ہوتی ہے' کسی بیماری سے دوچار ہوتا ہے یا کوئی غم لاحق ہوتا ہے' حتیٰ کہ اگر اسے کوئی خیال بھی فکرمند کر دے' تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''

حضرت عبداللہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ کو تو بڑا سخت اور تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَجَلْ، إِنِّي أُوعَكُ كَمَا يُوعَكُ رَجُلَانِ مِنْكُمْ)) قُلْتُ: ذٰلِكَ أَنَّ لَكَ أَجْرَيْنِ. قَالَ: ((أَجَلْ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ، مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيبُهُ أَذًى شَوْكَةٌ فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا سَيِّئَاتِهِ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا))(۱۰)

''ہاں' مجھے اس طرح بخار چڑھتا ہے جیسے تمہارے دو آدمیوں کو بخار ہوتا ہے۔'' میں نے عرض کیا: پھر تو آپ کو دہرا اجر ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات اسی طرح

ہے۔ جس مؤمن کو کوئی بھی تکلیف پہنچے' چاہے کانٹا چبھے یا اس سے بھی زیادہ بڑی تکلیف ہو' اللہ اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت سے پتے گرتے ہوں۔''

یہی وجہ ہے کہ اللہ والے بلا و مرض وغیرہ سے پریشان نہیں ہوتے' بلکہ اسے صبر وشکر سے برداشت کرتے تھے' بلکہ بسا اوقات اس سے خوش ہوتے تھے۔

حضرت ابوسعید ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ آپ ﷺ پر رکھا' تو میں نے لحاف کے اوپر سے بھی گرمائش محسوس کی۔ میں نے عرض کیا: یہ تو بڑا سخت بخار ہے۔ فرمایا:

((إِنَّا كَذٰلِكَ، يُضَعَّفُ لَنَا الْبَلَاءُ وَيُضَعَّفُ لَنَا الْأَجْرُ)) قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً؟ قَالَ: ((الْأَنْبِيَاءُ)) قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((ثُمَّ الصَّالِحُونَ، إِنْ كَانَ أَحَدُهُمْ لَيُبْتَلٰى بِالْفَقْرِ حَتّٰى مَا يَجِدُ أَحَدُهُمْ إِلَّا الْعَبَاءَةَ يُحَوِّيهَا، وَإِنْ كَانَ أَحَدُهُمْ لَيَفْرَحُ بِالْبَلَاءِ كَمَا يَفْرَحُ أَحَدُكُمْ بِالرَّخَاءِ))(۱۱)

''ہمارا ایسا ہی معاملہ ہے' ہمیں سخت آزمائش آتی ہے اور دہرا اجر ملتا ہے۔'' میں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! سب سے سخت آزمائش کس کی ہوتی ہے؟' فرمایا: ''انبیاء کی۔'' میں نے پوچھا: اس کے بعد کس کی باری ہے؟ فرمایا: ''نیک لوگوں کی۔ ان میں سے کوئی کوئی تو فقر و فاقہ کے ذریعے آزمایا جاتا ہے' بس اس کے پاس ایک چادر ہوتی تھی' جسے وہ اپنے جسم پر لپیٹ لیتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی کوئی تکلیف سے اس طرح خوش ہوتا ہے جیسے تم آسانی سے خوش ہوتے ہو۔''

یہی وجہ ہے کہ یہ امر شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے کہ کسی کو بیماری یا اسی قسم کے مصائب سے سابقہ ہی نہ پڑے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں:

جاء أعرابيٌ فقال النبي ﷺ: ((هَل أَخَذَتْكَ أُمُّ مِلْدَمٍ؟)) قَالَ: ومَا أُمُّ مِلْدَمٍ؟ قَالَ: ((حَرٌّ بَيْنَ الجِلدِ وَاللَّحْمِ)) قَالَ: لَا. قَالَ: ((فَهَل صُدِعْتَ؟)) قَالَ: ومَا الصُّدَاعُ؟ قَالَ: ((رِيحٌ تَعْتَرِضُ فِي الرَّأْسِ تَضْرِبُ العُرُوقَ))، قَالَ: لَا. قَالَ: فَلَمَّا قَامَ قَالَ: ((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى رَجلٍ مِنْ أَهلِ النَّارِ، أَي: فَلْيَنْظُرهُ))(۱۲)

''ایک دیہاتی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا‘ تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تمہیں کبھی اُمِّ مِلدم ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا: اُمِّ مِلدم کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جلد اور گوشت کے درمیان گرمائش (بخار) ہوتی ہے''۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تمہیں کبھی صُداع ہوا ہے؟'' اس نے کہا: یہ صداع کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سر میں ہوا بھر جاتی ہے‘ جو رگوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔'' اس نے کہا: نہیں۔ جب وہ چلا گیا‘ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی کو پسند ہو کہ وہ کسی جہنمی کو دیکھے وہ اسے دیکھ لے۔''

''اُمّ ملدم'' بخار اور تپ کو کہتے ہیں‘ جس کی وجہ سے جسم میں پانی کم ہو جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بخار انسان کو بہت کمزور کر دیتا ہے اور پچھاڑ دیتا ہے‘ کیونکہ لدم کے معنی ہیں زور سے پچھاڑنا یا دونوں ہاتھ سے طمانچہ مارنا۔

(۵) درجات کی بلندی: اسودؒ بیان کرتے کہ ایک نوجوان سیدہ عائشہ ؓ کے پاس آیا اور آپ منیٰ میں تھیں‘ اور وہ لوگ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ پوچھا: تم کیوں ہنس رہے ہو؟ کہنے لگے: فلاں شخص خیمے کی رسی پر گرا ہے۔ اس کی آنکھ یا گردن ضائع ہوتے ہوتے بچی ہے۔ آپؓ نے فرمایا: تم مت ہنسو‘ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُشَاكُ شَوْكَةً فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كُتِبَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ وَمُحِيَتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ))(۱۳)

''جس مسلمان کو کوئی کانٹا بھی چبھ جائے یا اسے کوئی چھوٹی تکلیف آئے‘ مگر اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بڑھا دیا جاتا ہے اور ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔''

انبیاء کرام علیہم السلام جو گناہوں سے پاک ہوتے ہیں‘ اُن کے آزمائش سے دوچار ہونے میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔ چونکہ ان کے درجات بہت اونچے ہیں‘ اس لیے ان کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! کس آدمی کو سب سے زیادہ مصیبت آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ، فَالْأَمْثَلُ، فَيُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ..... فَمَا يَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ مَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ))(۱۴)

''انبیاء کو‘ پھر جو اُن کے قریب تر ہوتے ہیں‘ پھر جو اُن کے قریب تر ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کو اُس کے دین کے اعتبار سے آزمایا جاتا ہے............ ایک آدمی کو مستقل مشکلات آتی رہتی ہیں‘ بالآخر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اُس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔''

سیدہ فاطمہ بنت الیمانی ؓ نامی ایک صحابیہ بیان کرتی ہیں کہ ہم چند عورتیں آپ ﷺ کی تیمارداری کے لیے حاضر ہوئیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ایک مشکیزہ لٹکا ہوا ہے جس کا پانی آپ ﷺ پر قطرہ قطرہ گر رہا ہے‘ کیونکہ آپ کو بخار کی سخت گرمی لگ رہی تھی۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ اللہ سے دعا کرتے تو وہ آپ کو شفا دے دیتا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءَ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ))(۱۵)

''سب سے زیادہ سختیاں انبیاء پر آیا کرتی ہیں‘ پھر جو اُن کے بعد ہوتے ہیں‘ پھر جو اُن کے بعد ہوتے ہیں‘ پھر جو اُن کے بعد ہوتے ہیں۔''

ابتلاء و مصائب کے سلسلے میں یہ حدیث بھی قابل غور ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ ابْتَلَاهُ اللهُ فِي جَسَدِهِ أَوْ فِي مَالِهِ أَوْ فِي وَلَدِهِ، ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلَى ذٰلِكَ، حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِي سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ تَعَالَى))(۱۶)

''بندے کا اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مقام لکھا ہوتا ہو اور وہ اپنے عمل سے اس مقام تک نہیں پہنچ پاتا‘ تو اللہ تعالیٰ اس کی جان میں یا مال میں یا اولاد میں تکلیف دے کر آزماتا ہے‘ پھر اس پر اُسے صبر بھی عطا کر دیتا ہے‘ بالآخر وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے پہلے سے لکھا ہوتا ہے۔''

(۶) دنیا ہی میں اچھا بدلہ: بسا اوقات اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کو کسی مرض میں مبتلا کرتا ہے‘ یا کسی قسم کی مصیبت سے دوچار کرتا ہے‘ تو اس کے عوض اسے اسی دنیا میں کسی بڑی نعمت سے نوازتا یا کسی بڑی مصیبت سے بچاتا ہے۔

حضرت اُمّ سُلیمؓ کا واقعہ: حضرت اُمّ سُلیم کا بیٹا فوت ہو گیا تو انہوں نے صبر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

دوسرا بیٹا عطا کر دیا‘ جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی۔ (۱۷)

حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے کا واقعہ: دشمنوں نے بدنام کرنے کی سازش کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کی پاکیزگی آسمان سے نازل کر کے تاقیامت اسے قرآن کا حصہ بنا دیا۔ (۱۸)

اگر ہم اپنے حافظے پر تھوڑا سا زور دیں تو ماضی قریب کی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے آ جائیں گی۔ ؎

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

(۷) حقیقتِ توحید کا اثبات: انبیاء کرام ؊ اور اللہ کے نیک بندوں کو مصائب و پریشانیوں میں مبتلا کرنے کی ایک بڑی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ لوگوں کے سامنے واضح ہو جائے کہ یہ شخصیات خواہ کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہوں‘ وہ عبادت کے لائق نہیں ہیں بلکہ مشیتِ الٰہی کے سامنے مجبورِ محض ہیں۔ اگر وہ کسی چیز کے مالک ہوتے تو سب سے پہلے اپنے اوپر سے بلا و مصیبت کو دور کر لیتے۔ چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اگر الوہیت و ربوبیت کا کوئی خاصہ اپنے اندر رکھتے تو انہیں سولی پر [نصرانی عقیدے کے مطابق] نہ لٹکایا جاتا۔ اگر ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کسی نفع وضرر کے مالک ہوتے تو غزوۂ اُحد میں ان کے ستر ساتھی شہید نہ ہوتے اور خود ہمارے نبی ﷺ کے دندانِ مبارک شہید نہ ہوتے۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں بھی ہیں۔

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸)﴾ (الاعراف)

’’آپ فرما دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی نقصان سے بچنے کا‘ مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ نے چاہا ہو۔ اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا‘ تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور کوئی نقصان مجھ کو نہ پہنچتا۔ میں تو محض خبردار کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔‘‘

سورۃ الجن میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۲۰) قُلْ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۲۱) قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۥ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲)﴾

’’آپ کہہ دیجیے کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ کہہ دیجیے کہ مجھے تمہارے کسی نقصان اور نفع کا اختیار نہیں۔ کہہ دیجیے کہ مجھے ہرگز کوئی اللہ سے بچا نہیں سکتا اور میں ہرگز اُس کے سوا کوئی جائے پناہ بھی پا نہیں سکتا۔‘‘

یحییٰ بن سعد بن زرارہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن زرارہ ؓ کے حلق میں ایک بیماری لاحق ہوئی‘ جسے ’’ذبحہ‘‘ کہتے ہیں۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَأُبْلِغَنَّ أَوْ لَأُبْلِيَنَّ فِي أَبِي أُمَامَةَ عُذْرًا)) ’’میں ابوامامہ کے علاج کی پوری کوشش کروں گا حتیٰ کہ معاملہ میرے بس سے باہر ہو جائے‘‘ تاکہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ چنانچہ اس کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں داغا بھی‘ لیکن وہ جان بر نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ (یہ دیکھ کر یہودی باتیں کرنے لگے کہ یہ اللہ کے کون سے نبی ہیں کہ اپنے ساتھی کو بری موت سے نہ بچا سکے۔ یہ سن کر) آپ ﷺ نے فرمایا: ((مِيتَةَ سَوْءٍ لِلْيَهُودِ ، يَقُولُونَ : أَفَلَا دَفَعَ عَنْ صَاحِبِهِ؟ وَمَا أَمْلِكُ لَهُ وَلَا لِنَفْسِي شَيْئًا)) ’’بُری موت یہودیوں کو ہو‘ وہ کہتے ہیں کہ اس نبی نے اپنے ساتھی کی جان کیوں نہ بچا لی! مَیں تو اُس کے لیے اور اپنے لیے اللہ کے فیصلے کے مقابلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔‘‘ (۱۹)

اگر حضرت نوح علیہ السلام اپنے لیے کسی بھی نفع و نقصان کے مالک ہوتے تو یوں دعا نہ کرتے: ﴿فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰)﴾ (القمر) ’’پس اُس نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے رب! میں مغلوب و بے بس ہوں‘ تو میری مدد کر!‘‘ ﴿قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ (۱۱۷) فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱۸)﴾ (الشعراء) ’’آپ نے کہا: اے میرے پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا۔ پس تو مجھ میں اور ان میں کوئی قطعی فیصلہ کر دے اور مجھے اور میرے باایمان ساتھیوں کو نجات دے۔‘‘

اسی طرح اگر حضرت لوط علیہ السلام کے پاس کوئی غیبی قوت ہوتی تو ان الفاظ میں اپنی مجبوری کا اظہار نہ فرماتے: ﴿قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (۸۰)﴾ (ہود) ’’لوطؑ نے کہا: کاش کہ مجھ میں تم سے مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست کا سہارا پکڑ پاتا۔‘‘

(۸) اللہ کے نزدیک بندے کی محبوبیت کی دلیل: حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا أرادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ العُقُوبَةَ فِي الدُّنيا، وإذَا أرادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عنهُ بِذَنْبِهِ حتّٰى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[۲۰]

’’جب اللہ اپنے بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو دنیا میں ہی اسے سزا دے دیتا ہے‘ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کا نقصان چاہتا ہے تو اس کے گناہ کو سنبھال کر رکھتا ہے تا کہ قیامت کے دن اس کا حساب پورا پورا چکا دے۔‘‘

حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عِظَمُ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ، وَإِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا ، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ))[۲۱]

’’بلاشبہ بڑا ثواب بڑی آزمائش کا ہوتا ہے‘ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ تو جو اللہ کی آزمائش پر راضی رہے‘ تو اسے اللہ کی رضا ملے گی اور جو اللہ کی آزمائش پر ناراض ہوگا‘ اس سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوگا۔‘‘

(۹) عبرت کا سبب: انسان کے نفس و مال اور اولاد وغیرہ میں جو آزمائش آئے‘ اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس سے عبرت حاصل کرے‘ اپنے بارے میں نظر ثانی کرے اور اپنا محاسبہ کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۶۸﴾ (الأعراف)

’’اور ہم انہیں اچھے اور برے حالات سے آزماتے رہے کہ شاید وہ اللہ کی طرف پلٹ آئیں۔‘‘

سورۃ الشوریٰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝۳۰﴾

’’تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کا بدلہ ہے‘ اور وہ تو بہت سی باتوں سے درگزر فرما دیتا ہے۔‘‘

حضرت علی ؓ نے فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو کتابِ الٰہی کی سب سے افضل آیت نہ بتلاؤں‘ جو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتلائی ہے؟ وہ آیت یہ ہے: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ

مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝۳۰﴾ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے علی! میں تمہیں اس کی تفسیر بتلاتا ہوں: ((﴿مَآ اَصَابَكُمْ﴾ من مرض أو عقوبة أو بلاء في الدنيا ﴿فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ والله تعالى أكرم من ان يثني عليهم العقوبة في الآخرة وما عفا الله تعالى عنه في الدنيا فالله تعالى أحلم من أن يعود بعد عفوه))

’’بیماری‘ سزا اور دنیاوی بلاؤں کی شکل میں جو کچھ تمہیں لاحق ہوتا ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں‘ اور اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ اپنے بندے کو دنیا میں سزا دے دینے کے بعد دوبارہ آخرت میں بھی سزا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بہت ہی حلیم ہے اور اس کے حلم کے یہ منافی ہے کہ معاف کر دینے کے بعد وہ دوبارہ گرفت کرے۔‘‘ (۲۲)

حضرت براء بن عازب ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا اخْتَلَجَ عِرْقٌ وَلَا عَيْنٌ إِلَّا بِذَنْبٍ، وَمَا يَدْفَعُ اللّٰهُ عَنْهُ أَكْثَرُ))[۲۳]

’’کوئی رگ یا آنکھ نہیں پھڑکتی مگر کسی گناہ کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے‘ اور اللہ اکثر گناہوں سے ویسے ہی درگزر کر دیتا ہے۔‘‘

لہٰذا کسی بھی مصیبت و پریشانی کے موقع پر ایک مسلمان کو یہ احساس سب سے پہلے ہونا چاہیے کہ یہ بلا میرے کسی گناہ اور کوتاہی کے سبب ہی سے ہے۔

حضرت عمران بن حصین ؓ کو بواسیر کی بیماری تھی‘ جس کی وجہ سے خصوصاً عمر کے آخری ایام میں بہت ہی تکلیف میں تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک بار ان کے ایک شاگرد نے کہا کہ جب میں آپ کو اس مصیبت کی حالت میں دیکھتا ہوں‘ تو مجھے بڑا غم ہوتا ہے۔ حضرت عمران ؓ نے فرمایا: مجھے اس حال میں دیکھ کر پریشان نہ ہو‘ یہ سب کچھ ہمارے بعض گناہوں کا بدلہ ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝۳۰﴾ (الشوریٰ)[۲۴]

مشہور تابعی ابن ابی ملیکہؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ کے سر میں درد ہوتا‘ تو وہ سر پر ہاتھ رکھتیں اور کہتیں: ’’یہ سب کچھ میرے گناہ کا نتیجہ ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا وہ بہت زیادہ ہے۔‘‘[۲۵]

ان کے علاوہ ابتلاء وآزمائش کے اور بھی بہت سی فائدے ہو سکتے ہیں' جیسے:

(۱) بندے کا اپنے رب کی طرف رجوع کرنا اور غفلت سے بیداری

(۲) ایک مؤمن کا اپنے اوپر اللہ کی دیگر بہت سی نعمتوں کو یاد کرنا' کیونکہ یہ آزمائش اللہ کی دیگر نعمتوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

(۳) گھمنڈ اور تکبر وغیرہ جیسے امراض سے دل کی صفائی

(۴) اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کو یاد کرنا وغیرہ

(جاری ہے)

حواشی

(۱) الادب المفرد:۴۹۳

(۲) صحیح البخاري:۳۶۱۲ علامات النبوة، سنن ابي داؤد:۲۶۵۱ الجهاد، مسند احمد:۱۰۹/۵

(۳) صحیح البخاري:۶۴۸۷ الرقائق، صحیح مسلم:۲۸۲۲ الجنة.

(۴) صحیح البخاري:۵۶۵۲ المرضی، صحیح مسلم:۲۵۷۶ البِر والصلة

(۵) الأدب المفرد:۵۰۲

(۶) مسند البزار، کشف الاستار ۳۶۴/۱' ح:۷۶۵، بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا

(۷) سنن الترمذي:۲۰۸۸، سنن ابن ماجة:۳۴۷۰، مسند احمد ج ۴۴۰/۴

(۸) سنن الترمذی:۲۳۹۹ الزهد، مستدرک الحاکم ۳۴۶/۱، مسند احمد ۲۷۸/۲، الادب المفرد:۴۹۴

(۹) صحیح البخاري:۵۶۴۱، ۵۶۴۲ المرضی، صحیح مسلم:۲۵۷۳ البِر والصلة

(۱۰) صحیح البخاري:۵۶۴۸ المرضی، صحیح مسلم:۲۵۷۱ البِر والصلة

(۱۱) سنن ابن ماجة:۴۰۲۴ الفتن، مسند احمد ۹۴/۳، مستدرك الحاكم ۳۰۷/۴

(۱۲) الادب المفرد:۴۹۵، مسند احمد ۳۳۲/۲، صحیح ابن حبان:۲۶۰/۴

(۱۳) صحیح مسلم:۲۵۷۲ البِر والصلة۔ اس حدیث کا مرفوع حصہ صحیح البخاری:۵۶۴۰ میں بھی ہے۔

(۱۴) سنن الترمذي:۲۳۹۸ الزهد، سنن ابن ماجة:۴۰۲۳ الفتن، سنن الدارمي ۳۲/۲

(۱۵) مسند احمد:۲۳۹/۵، مستدرك الحاكم ۴۰۴/۴۔ دیکھئے الصحیحة:۱۴۵

(۱۶) سنن ابي داؤد:۳۰۹۰ الجنائز، الطبراني الأوسط:۱۰۵۰، مسند احمد ۵ / ۲۷۲، بروایت محمد السلمي

(۱۷) صحیح البخاری:۱۳۰۱ الجنائز مع الفتح ۱۶۹/۳، ۱۷۱۔

(۱۸) صحیح البخاری:۲۶۶۱ الشهادات، ۴۱۴۱ المغازی، صحیح مسلم:۲۷۷۰ التوبة۔

(۱۹) سنن ابن ماجة:۳۴۹۲ الطب، مسند احمد ۶۵/۴ و ۱۳۸

(۲۰) سنن الترمذي:۲۳۹۶ الزهد، مسند أبو یعلی:۴۲۵۲، مستدرك الحاكم ۶۰۸/۴

(۲۱) سنن ابن ماجة:۴۰۳۱ الفتن

(۲۲) مسند احمد ۸۵/۱۔ علامہ احمد شاکرؒ نے اس حدیث کو حسن بتلایا ہے۔ شرح مسند احمد ۶۱/۱

(۲۳) الطبراني الصغیر ۱۰۳/۲، دیکھئے الصحیحة:۲۲۱۵

(۲۴) مستدرك الحاكم ۴۸۳/۲ (الشاملة)، شعب الإيمان:۹۳۵۶، المرض والکفارات:۲۴۹

(۲۵) تفسیر الدر المنثور ۳۵۵/۷

❁❁❁

بقیہ: منبعِ نور کی بازیافت

وہ نفوسِ مطمئنہ جو حیاتِ دُنیوی میں نورِ ایمان ونورِ عمل کی پونجی جمع کر سکے' وہی پُل صراط کے اندھیاروں میں روشنی کے مستحق ہوں گے اور اپنے رب کے حضور یوں دعا گو ہوں گے:

﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑧﴾ (التحریم)

''وہ کہتے ہوں گے: اے ہمارے ربّ! ہمارے لیے ہمارے نُور کو کامل کر دے اور تُو ہمیں بخش دے' یقیناً تُو ہر شے پر قادر ہے۔''

یہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو اتمامِ نورِ الٰہی کے عظیم ترین مشن میں کھپا دیا۔ چنانچہ آج اُن کے لیے اُن کا رب اُن کا نور مکمل فرما دے گا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!!

❁❁❁

قرآن کے اصل مخاطب کون؟

حافظ محبوب احمد

قرآن ہم پر مؤثر کیوں نہیں ہے؟ انسان پر کسی چیز کے اثر انداز ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بجائے خود مؤثر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اثر پزیری کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ سورج لاکھ چمکے لیکن ایک شخص اگر بینائی سے ہی محروم ہے تو سورج کے چمکنے سے اس کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے! اسی طرح قرآن کا نور ہونا‘ بصیرت ہونا‘ سرچشمۂ ہدایت ہونا مسلّم ہے‘ لیکن اگر کسی نے اپنی وہ صلاحیت ہی ضائع کردی ہے جو اس نور اور سرچشمۂ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے تو آخر قرآن کیا کرے گا؟ قرآن کریم کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تشکیل و استحکام میں کچھ لوگوں کو خاص حیثیت دی گئی ہے اور ان کی ذمہ داریوں کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

قرآن ہر پڑھنے والے کے لیے یکساں اہداف نہیں رکھتا۔ جو لوگ حضرات ابوبکر صدیق‘ عمر‘ عثمان ؓ کو اپنی زندگی میں آئیڈیل بناتے ہیں انہیں مطالعہ قرآن کے وقت ان ہستیوں کا کردار و عمل بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کے لیے دین کے مقابلے میں ان کی جان و مال کی حیثیت ثانوی ہونی چاہیے۔ کچھ لوگ قرآن سے ہدایت نہیں دُنیوی مفادات کے لیے تعلق قائم کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے شاہین و گدھ۔ ع ”کرگس کا جہاں اور ہے‘ شاہیں کا جہاں اور!“ دونوں اپنے اہداف کے لیے فضا میں اڑتے ہیں۔ شاہین اپنا ہدف فضاؤں میں تلاش کرتا ہے جبکہ گدھ زمین کی پستیوں کا رُخ کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کی زبان آیت مبارکہ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ﴾ (المؤمنون:۵۱) ”اے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو“ کی تلاوت کررہی ہوتی ہے مگر ہاتھ ”اوساخ النّاس“ کے حصول کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ سیدنا حکیم بن حزام ؓ کی روایت کردہ حدیث ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ)) پڑھتے بھی اور جانتے بھی ہیں مگر عملاً ((اَلْيَدُ السُّفْلٰى)) کو اپنا ہدف و مقصود بناتے

ہیں۔ ((وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ)) ”اور جو کوئی سوال سے بچنا چاہے گا اسے اللہ تعالیٰ بھی محفوظ رکھتا ہے“ کی تشریح و توضیح میں بھی اپنا علم و بیان صرف کرتے ہیں مگر مخلوق سے سوال کرنے میں ذرا تامل سے کام نہیں لیتے۔ ((وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ)) ”اور جو دوسروں کے مال سے بے نیاز رہتا ہے‘ اسے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہی بنا دیتا ہے“ کی تعلیم ان کے دل پر ذرا اثر نہیں کرتی اور وہ اس پر یقین کے لیے کبھی راضی نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ تو محض اس لیے قرآن سیکھتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے ”معمولی مفادات“ حاصل کرسکیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے وہ تجوید و قراءت بھی سیکھتے ہیں اور مسائل قرآن بھی۔ رسول اللہ ﷺ کے مہمان کے لیے حضرت ابوطلحہ انصاری ؓ اور ان کی بیوی کے میزبان بننے کا واقعہ تو بیان کرتے ہیں مگر خود ”میزبان“ بننے کے بجائے ساری عمر کے لیے ”مہمان“ ہی بننا پسند کرتے ہیں‘ یہ جانتے ہوئے کہ ان صحابی کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے مسکرانے کا سبب بنا اور ان کی تعریف ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۹) کی آیت مبارکہ میں فرمائی گئی۔

قرآن سے اپنا تعلق قائم کرتے وقت ہمیں اپنا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ اس عمل کی نوعیت کیا ہے! پست اور سطحی نظریات قرآن سے تعلق کے باوجود بھی اعلیٰ عمل کو جنم نہیں دے سکتے۔ قرآن میں ایمانیات کے بعد جو دو بنیادی عملی تقاضے کیے گئے ہیں‘ ان میں سے ایک ”اقامتِ صلوٰۃ“ اور دوسرا ”انفاق فی سبیل اللہ“ ہے۔ انسانی کردار و عمل کی نشوونما کے لیے یہ دونوں تعلیمات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

مطالعہ قرآن کے وقت یہ جائزہ بھی لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کن صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان کا حامل ہونے کی وجہ سے ہم پر کون کون سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان ذمہ داریوں کو بہت خوبصورت عنوانات سے سجایا ہے اور ایسی اصطلاحات استعمال کی ہیں جن پر غور و فکر کرنے سے نئے جہان کھل جاتے ہیں۔ ان ہی میں سے چند اصطلاحات کا احاطہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ ان اصطلاحات کی لغوی و اصطلاحی تعریف و مختصر تشریح بھی کی گئی ہے‘ جبکہ ان کی ”ضد“ سے اعراض کیا گیا ہے کہ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

(۱) اُولُوا الالباب

اُولُو جمع ہے ذُو کی‘ یعنی والے‘ مالک۔ لُبّ کے اصل معنی تو مغز کے ہیں‘ جو کہ ہر چیز

کا خلاصہ ہوتا ہے یعنی خالص عقل‘ اصل شعور‘ باطنی بصیرت اس کی جمع ہے الالباب۔ لبیب عقل مند آدمی کو کہتے ہیں۔ اسی سے اس کی خاصیت وفوائد معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی عقل کو لُبّ کہا گیا ہے‘ کیونکہ عقل ہی انسان کا اصلی جوہر ہے۔ اولوا الالباب کے معنی ہوئے: عقل والے‘ یعنی وہ لوگ جو خالص عقل‘ بصیرت اور گہرے شعور والے ہیں۔

قرآن کے نزدیک ’’اولوا الالباب‘‘ صرف وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کے نظام پر غور کر کے خدا کے ذکر اور آخرت کی فکر تک رہنمائی حاصل کریں۔ جن کو یہ چیز حاصل نہیں ہوئی‘ وہ چاہے زمین و آسمان کی تمام مسافت ناپ ڈالیں اور چاند و مریخ تک سفر کر آئیں لیکن وہ اولوالالباب نہیں ہیں۔ ان کے سروں پر کھوپڑیاں تو ہیں لیکن ان کے اندر مغز نہیں ہے۔ اگر ان کے اندر مغز ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انہیں باقی سب کچھ تو نظر آ جاتا لیکن یہ تل کی اوٹ پہاڑ نظر نہ آتا۔ ’’تفسیر طبری‘‘ میں امام طبریؒ کہتے ہیں: ’’اولوا الالباب سے مراد وہ لوگ ہیں جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں اور اس عقل کو حق کی پہچان میں استعمال کرتے ہیں۔‘‘ یعنی ہر شخص کے پاس عقل تو ہے‘ مگر لُبّ یعنی خالص اور صاف عقل وہ ہے جو خواہشات‘ تعصب اور جہالت سے پاک ہو۔ ’’تفسیر کبیر‘‘ میں امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں: ’’اولوا الالباب ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عقل کو نفس کی غلامی سے آزاد رکھا‘ اور غور و فکر کے ذریعے حق تک پہنچتے ہیں۔‘‘ تفسیر قرطبی میں ہے: ’’لُبّ اصل عقل کو کہتے ہیں‘ جیسے کسی چیز کا مغز۔ تو اولوا الالباب وہ ہیں جو ظاہری سطح پر اٹکے نہیں رہتے‘ بلکہ چیزوں کی حقیقت تک پہنچتے ہیں۔‘‘ تفسیر ابن کثیر میں کئی مقامات پر ہے: ’’اولوا الالباب وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات میں غور کرتے ہیں‘ دنیا کی حقیقت کو جانتے ہیں‘ اور ان کی عقل انہیں رب کی طرف جھکنے پر آمادہ کرتی ہے۔‘‘

﴿يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾﴾ (البقرۃ)

’’وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔ اور نہیں نصیحت حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو ہوش مند ہیں۔‘‘

اس آیت میں ’’اُولُوا الْاَلْبَابِ‘‘ سے مراد وہ لوگ ہیں جو صاف ستھری اور پاکیزہ عقل کے مالک ہیں اور نصیحت و دانائی کو قبول کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی عطا کردہ حکمت

(یعنی دین کے صحیح فہم اور علم وفقہ میں بصیرت) سے فیض یاب ہوتے ہیں اور اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ صاحب عقل و دانش‘ پاکیزہ عقل والے‘ جن کے پاس ایسی عقل ہے جو نصیحت کو قبول کرتی ہے۔ حکمت سے فیض یاب لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ حکمت دیتا ہے اور وہ اس سے مستفید ہوتے ہیں‘ جس کی وجہ سے انہیں بہت بڑی بھلائی ملتی ہے۔

(۲) پختہ و مضبوط علم والے

معاشرے کا یہ جوہر ’’صائب الرائے‘‘ افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی و روحانی رُخ کو درست سمت میں رکھتا ہے۔ اس طبقے کا صحیح رخ پر ہونا تب ہی ممکن ہے جب یہ اپنے علم اور عمل کو صرف اللہ کے لیے خاص کر لے اور دُنیوی مفادات سے اپنی ان صلاحیتوں کو آلودہ نہ ہونے دے۔ فکری کج روی منتشر عمل کو جنم دیتی ہے اور انسان کی شخصیت کے لیے مضر جبکہ معاشرے کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾﴾

’’وہی ہے جس نے آپؐ پر یہ کتاب نازل فرمائی‘ اس میں محکم آیات ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں‘ اور کچھ دوسری آیتیں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ پیچھے لگتے ہیں ان آیات کے جو ان میں سے متشابہ ہیں‘ فتنے کی تلاش میں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کے لیے‘ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر‘ یہ کُل کا کُل ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں۔‘‘

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَاسِخٌ فِي الْعِلْمِ وہ عالم باعمل ہے جو اپنے علم کی پیروی کرنے والا ہو۔ مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ رَاسِخٌ فِي الْعِلْمِ وہ ہیں جن میں یہ چار صفات ہوں: اللہ کا تقویٰ‘ لوگوں کے ساتھ تواضع‘ دنیا سے زُہد اور نفس سے مجاہدہ۔ (تفسیر خازن)

عقل بہت بڑی فضیلت اور خوبی ہے‘ جس کے ذریعے ہدایت و نصیحت ملتی ہے۔ جس عقل سے ہدایت نہ ملے وہ بدترین حماقت ہے‘ جیسے طاقت اچھی چیز ہے لیکن جو طاقت ظلم کے لیے استعمال ہو وہ کمزوری سے بھی بدتر ہے۔

(۳) روح کی نشوونما کرنے والے

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹﴾ (صٓ)

’’(اے نبیﷺ!) یہ کتاب جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بہت بابرکت ہے‘ تاکہ وہ اس کی آیات پر تدبر کریں اور ہوش مند لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔‘‘

اسے سمجھنے کے لیے ایک ایسے شخص کی مثال لیں جس کے اندر بالقوۃ (potentially) کوئی مثبت صلاحیت یا اہلیت موجود ہے مگر چونکہ اس کی وہ صلاحیت غیر فعال ہے اس لیے نہ تو اسے اس کا شعور ہے اور نہ ہی وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی واقعہ یا کسی دوسرے شخص کا کوئی عمل یا کسی کی کوئی نصیحت اسے اس صلاحیت کا احساس دلا دے اور وہ اسے بروئے کار لانا شروع کر دے تو وہ واقعہ یا عمل گویا اس کے لیے برکت کا باعث بن گیا۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو انسانی روح کی نشوونما کے لیے غذا فراہم کرتی ہے اور روح کے اندر موجود خیر اور نیکی کی غیر فعال صلاحیت کو انگیخت دے کر اسے عمل صالح کے صدور کے قابل بناتی ہے۔ علامہ اقبال نے روح کی اہمیت کا احساس ان الفاظ میں دلایا ہے: ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

(۴) دانا و بینا

یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ معاشرے کو چلانے والے افراد کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے جنہیں معاشرے کا دماغ کہا جاتا ہے۔ ان کی سوچ و فکر معاشرے میں نیکی و برائی کے پیمانے مقرر کرتی ہے۔ قرآن بھی اپنے ماننے والوں سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس حیثیت کے حامل ہوں تاکہ قرآن کے نظریات کے مطابق معاشرے کو ڈھالا جا سکے۔ بے مغز‘ کھوکھلے افراد معاشرے کے کچرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض مفسرین کے بقول درج ذیل آیت لوگوں کو حصولِ علم کی تاکید کرتی ہے کیونکہ اس میں بے علم اور دانش سے محروم افراد کو نابینا قرار دیا گیا ہے۔

﴿اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ط اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۱۹﴾ (الرعد)

’’(اے نبیﷺ!) کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ پر آپ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا وہ حق ہے‘ بھلا اُس جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ یقیناً نصیحت تو عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔‘‘

(۵) قوتِ نظری اور قوتِ عملی کے حامل

امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں: قوتِ نظری اور قوتِ عملی۔ انہی کی تکمیل میں انسان کی ترقی اور کمال کا راز پنہاں ہے۔ قوتِ نظری کا کام موجودات کے حقائق کو جاننا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ سب سے اعلیٰ اور ارفع حقیقت یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا عرفان اسے حاصل ہو جائے۔ قوتِ عملی کا کام یہ ہے کہ انسان اخلاقِ فاضلہ سے متصف ہو جائے۔ سب سے افضل اور احسن خلق یہ ہے کہ انسان خداوند ذوالجلال کی اطاعت کو اپنا شعار بنا لے۔

یہ دونوں کمال قرآن کریم میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص ہدایت طلبی کے جذبہ سے سرشار ہو کر قرآنی دلائل و براہین کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بے ساختہ یہ کہہ اٹھتا ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ جب یقین کا یہ چراغ روشن ہو جاتا ہے تو عمل کی شاہراہ جگمگانے لگتی ہے اور وہ مستانہ وار یہ کہتا ہوا اس پر گامزن ہو جاتا ہے: اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی میں نے اپنا سر اطاعت و انقیاد ربّ العالمین کے ہر حکم کے سامنے جھکا دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۵۲﴾ (ابراهيم)

’’یہ پہنچا دینا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ اس کے ذریعے سے خبردار کر دیے جائیں‘ اور تاکہ وہ جان لیں کہ صرف وہی معبود ہے اکیلا‘ اور اس لیے کہ نصیحت اخذ کریں عقل والے لوگ۔‘‘

(۶) اہلِ ثروت کی ذمہ داریاں

اسلامی معاشرے کی معاشی تشکیل اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں صلاحیتوں کے اعتبار

سے ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا ہے۔ کسی خاص نسلی/لسانی گروہ پر معاشی ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالا گیا کہ ایک گروہ خود کو مفلوج کر لے اور دوسرا گروہ اس کی ذمہ داری اٹھائے۔ ان راستوں کا تعین کیا گیا ہے جن کے ذریعے گرے پڑے لوگ بھی معاشرے میں ''اُولُو الضَّرَر'' سے ''اُولُو الطَّوْل'' کے منصب پر آ سکیں۔ ''اولو الطول'' کا لغوی مطلب ہے ''لمبائی والے'' یا ''وسعت کے مالک''۔ اصطلاحی طور پر اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے پاس دولت، مال، وسائل اور اثر و رسوخ ہو۔ معاشی، سماجی اور سیاسی وسعت کے حامل وہ لوگ جو صاحبِ ثروت، صاحبِ اختیار اور اثر و رسوخ کے مالک ہوں۔ یہ اصطلاح اکثر قرآنی آیات میں دُنیاوی وسائل اور قدرت کے مالک افراد کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ ایک طبقہ اگر صاحبِ ثروت افراد پر اپنی معاشی ذمہ داری مستقل طور پر ڈال دے تو یہ قرآن کے معاشی نظام کی روح کے خلاف ہے۔ قرآن دولت مندوں کے مثبت کردار کو پسند اور ان کے منفی کردار کی مذمت کرتا ہے۔ اگر یہ طبقہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرے گا تو اس کے نتیجے میں معاشرتی افراتفری پیدا ہوگی۔ کسی طبقے کو اس کی معاشی ذمہ داریوں سے مستقل طور پر استثناء نہیں سوائے ایسے افراد جو جسمانی معذوری کے حامل ہوں۔ ابتدائے اسلام میں صحابہ کرام ؓ اس کی روشن مثالوں کی شکل میں موجود ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝86﴾ (التوبة)

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو اُس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر، تو آپ سے رخصت مانگتے ہیں ان میں سے مقدرت والے بھی اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بیٹھ رہنے والوں میں شامل ہو جائیں۔''

(۷) بزرگی اور کشادگی والے

''اُولُوا الطَّوْل'' کے کردار کو سمجھنے کے بعد اب ہم ان افراد کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی شخصیت عوام الناس کے لیے بھی پسندیدہ ہے اور اللہ کی نظر میں بھی وہ عظیم المرتبت ہیں۔ ''اُولُو الْفَضْلِ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو فضیلت اور بزرگی والے ہیں۔ لغوی معنی میں ''فضیلت رکھنے والا'' اور اصطلاحی معنی میں کسی خاص علم، مقام یا ہنر کے لحاظ سے بلند مرتبہ شخص مراد لیا جاتا ہے۔

فقہ میں بعض اوقات اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے پاس فضیلت کی کوئی خصوصیت ہو، جیسے کہ علم و عمل میں بزرگی کے حامل افراد۔

قرآن مجید میں اس کا استعمال ان لوگوں کے لیے کیا گیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں سے زیادہ نعمتیں عطا کی ہوں، جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝22﴾ (النور)

''اور قسم نہ کھالیں تم میں سے فضیلت اور کشادگی والے لوگ اس پر کہ وہ (اپنے اموال میں سے) دیں قرابت داروں کو، مساکین کو اور مہاجرین کو اللہ کی راہ میں، اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

(۸) مصلحین

معاشرے میں اصلاح کے لیے کوشش کرنے والے ہمیشہ اور ہر حال میں پسندیدہ افراد ہوتے ہیں جبکہ فساد کبھی بھی مطلوب نہیں رہا۔ اصلاحی مقاصد کے لیے کی جانے والی یہ کوششیں ہی معاشرے کو زندگی دیتی ہیں۔ جہاں یہ کوششیں کمزور ہوتی ہیں وہیں ظلم اور فساد اپنی پوری طاقت سے ابھر آتا ہے۔ قرآن میں ان لوگوں کو پسند کیا گیا ہے۔

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝116 وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝117﴾ (هود)

''تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں حق کے ایسے علمبردار ہوتے جو (اپنی اپنی قوموں کے لوگوں کو) روکتے زمین میں فساد مچانے سے، مگر بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے جنہیں ہم نے اُن میں سے بچا لیا۔ اور پیچھے پڑے رہے وہ ظالم اُن عیش و آرام کی چیزوں کے جو انہیں دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے۔ اور آپؐ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کر دے جبکہ ان میں بسنے والے لوگ اصلاح کرنے والے ہوں۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں یہی مضمون یوں بیان کیا گیا:

﴿وَ اِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّہۡلِکَ قَرۡیَۃً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡہَا فَفَسَقُوۡا فِیۡہَا فَحَقَّ عَلَیۡہَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰہَا تَدۡمِیۡرًا ﴿۱۶﴾﴾

’’اور جب ہم ارادہ کرتے کہ تباہ کر دیں کسی بستی کو‘ تو ہم اُس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے اور وہ اس میں خوب نافرمانیاں کرتے‘ پس ثابت ہو جاتی اُس پر (عذاب کی) بات‘ پھر ہم اُس کو بالکل نیست و نابود کر دیتے۔‘‘

اب اُولُوۡا بَقِیَّۃٍ کے عنوان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بَقِيَّة (وہ شے جس کو باقی رکھا جائے یا وہ شے جو باقی رہے) سے مراد ہے عقل وخرد اور فضیلت۔ جو چیزیں آدمی باقی رکھتا ہے یا جو باقی رہنی چاہئیں ان میں عقل و دانش ہی سب سے اعلیٰ چیز ہے۔ جسمانی طاقت وصحت اور مال وغیرہ کا درجہ دانش وعقل سے کم ہے۔ اگر کسی میں کوئی اچھی بات اور بھلائی ہو تو اس کو ذُوۡ بَقِيَّة کہا جاتا ہے اور اگر کوئی برگزیدہ اور اعلیٰ طبقے میں سے ہو تو کہا جاتا ہے: هُوَ مِنْ بَقِيَّةِ الْقَوم۔ ایک اور کہاوت ہے: فی الزوایا خنایا وفی الرجال بقایا یعنی گوشوں میں کچھ چھپی چیزیں ہوتی ہیں اور آدمیوں میں کچھ اعلیٰ اشخاص ہوتے ہیں۔ بعض کے نزدیک بِقِيَّة سے طاعت مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ بِقِيَّة سے مراد ہے خیر باقی‘ یعنی اچھی خصلت۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بَقِيَّة مصدر ہو جیسے تَقِيَّة۔ قاموس میں ہے: بَقِيَ يَبْقٰى (س) بقاءً وَبقِيًّا۔ اس صورت میں اُولُو بَقِيَّة کا معنی ہوا: اپنے اوپر رحم کرنے والے اور اپنی جانوں کو عذاب سے محفوظ رکھنے والے۔

متذکرہ بالا آیت (ھود:۱۱۷) میں بہت خوب صورت انداز میں ان لوگوں کو اپنی جانوں پر رحم کرنے والے اور اپنی جانوں کو عذاب سے محفوظ رکھنے والے بیان کیا گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ معاشرے میں رحم وکرم کی صفات جنم لیتی ہیں۔

(۹) طاقت اور قوت والے

طاقت کا ہدف کیا ہونا چاہیے؟ یہ اگر اپنا ہدف کھو دے گی تو اقوام کی راہوں کو مزید تاریک بنا دے گی۔ اگر طاقت مضبوط اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو گی تو وہ اپنے ہدف کے حصول میں کامیابی کے نسبتاً زیادہ امکانات رکھتی ہے۔ طاقت اگر ہوسِ ملک گیری کے لیے ہو گی تو تاریخ اس کو ’’تموچن‘‘ (چنگیز خان) کی شکل میں اقوام کی تباہی کا باعث بنتے دیکھے گی۔ طاقت اگر ذاتی

برتری کے لیے ہو تو نپولین یورپی میدانوں اور روس کے برفیلے علاقوں کو خون سے نہلا دے گا۔ طاقت ہی کا ایک منفی پہلو تیمور لنگ جیسے کردار ہیں جو انسانی کھوپڑیوں کے پہاڑ بناتے نظر آتے ہیں۔ طاقت اگر معاشی محرومیوں کا بدلہ لینے کے لیے تشکیل دی جائے گی تو وہ ’’داس کیپٹل‘‘ کی صورت میں لاکھوں لوگوں کے قتلِ عام کا باعث بن جائے گی۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے مگر اسے اسلام کی روح کے مطابق استعمال کیا جائے تو ہی یہ ثمر آور بنے گی۔ اس معاملے میں قرآن ہماری راہنمائی کرتے ہوئے طاقت کا آئیڈیل مقصد اور ہدف بیان کرتا ہے اور مضبوط لوگوں کی تعریف و توصیف بھی کرتا ہے۔

’’اُولُو‘‘ کے معنی ہیں ’’کے مالک‘‘ یا ’’کے حامل‘‘ جبکہ ’’قُوَّۃ‘‘ کے معنی ہیں طاقت‘ اختیار یا صلاحیت۔ اس لیے ’’اُولُو قُوَّۃٍ‘‘ کا مطلب ہوا ’’طاقتور لوگ‘‘ یا ’’با اختیار لوگ‘‘۔ اصطلاحی طور پر‘ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کسی قسم کی طاقت ہے‘ خواہ وہ جسمانی طاقت ہو‘ مالی طاقت ہو‘ علمی طاقت ہو‘ یا سیاسی طاقت ہو۔

قرآن و حدیث میں اس سے مراد ایسے لوگ لیے جاتے ہیں جو اللہ کی راہ میں اپنی طاقت استعمال کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ انصاف قائم کرتے ہیں‘ عدل کو قائم کرنے کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ کمزوروں کی مدد کرتے اور ان پر ظلم کرنے سے بچتے ہیں۔ امن و استحکام کو فروغ دیتے اور سماجی بہبود کے لیے کام کرتے ہیں۔ طاقت کا استعمال اللہ کی اطاعت میں کرتے ہیں‘ نہ کہ اسے اپنے ذاتی مقاصد یا دوسروں پر ظلم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کی طاقت دی ہے تو وہ اسے علم کے فروغ اور معاشرے کی بہتری کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ہی ان کی طاقت کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّۃٍ وَّ اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ ۬ۙ وَّ الۡاَمۡرُ اِلَیۡکِ فَانۡظُرِیۡ مَاذَا تَاۡمُرِیۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ (النمل)

’’انہوں نے کہا: ہم طاقتور بھی ہیں اور زبردست جنگی صلاحیت والے بھی‘ اور فیصلے کا اختیار تو آپ ہی کے پاس ہے‘ چنانچہ آپ خود دیکھ لیں کہ کیا حکم دیتی ہیں۔‘‘

یہاں ’’اُولُو بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ‘‘ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ ’’اُولُوا‘‘ کا معنی ہے

"مالک"، "بَأس" کا معنی ہے "طاقت" یا "جنگ" اور "شَدِید" کا معنی ہے "مضبوط" یا "سخت"۔ لہٰذا اس کا لغوی معنی ہے "سخت طاقت والے لوگ۔"

(۱۰) صاحبِ اختیار (اُولُوا الامر)

یہ قرآن مجید میں استعمال ہونے والی ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں وہ تمام افراد شامل ہیں جنہیں معاشرتی اور سیاسی معاملات میں اختیار دیا گیا ہے' جیسے کہ حکام' علماء' اور ذمہ دار افراد جو لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

لغوی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں: "اولی الامر" کا لفظی مطلب "احکام والے لوگ" ہے۔

اصطلاح میں' یہ عام طور پر ان افراد کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے پاس لوگوں کے معاملات سنبھالنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ان میں حکام اور علماء دونوں شامل ہیں۔ اگر معاشرہ دینی تعلیمات پر قائم ہے تو سونے پر سہاگا' اس کی رہبری کا کام دین والے ہی سرانجام دیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لامحالہ یہ اختیار بٹ جائے گا اور علماء صرف دین کے ان معاملات میں راہنمائی دے سکتے ہیں جو ریاست کی پالیسی سے متعلق ہوں۔ دوسری صورت میں ریاست کے غیر اسلامی قوانین معاشرے میں انسانوں کی زندگی کو متاثر کرتے جائیں گے۔ تاہم اس کے باوجود بھی ریاست کے مقابلے میں علماء کرام کے مثبت کردار کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ معاشرہ محض ریاستی قوانین سے تشکیل نہیں پاتا بلکہ اخلاقی و روحانی تعلیمات کے بہت سے پہلو اس کو استحکام بخشتے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں علماء' حکام اور ان تمام لوگوں کا کردار ہے جو مسلمانوں کے معاملات سنبھالتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پیروی کریں' انصاف کریں' اور معاشرے کے لوگوں کے لیے بھلائی کا کام کریں۔ اصطلاحی تعریف میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جنہیں معاشرے کے انتظام اور نظم وضبط کا اختیار دیا گیا ہے۔

اولی الامر کو معاشرے کی دینی اور دنیاوی تعلیم یقینی بنانا چاہیے۔ اپنی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر نبھانا چاہیے' اور اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ معاشرتی ڈھانچا مستحکم رہے۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے فرائض کو پورے شعور سے انجام دیں اور کسی بھی غیر اسلامی سرگرمی میں شریک نہ ہوں۔ حکمران' علماء اور عوام کا سہ فریقی اتحاد ہی مسلم معاشرے کے استحکام کا ضامن ہے۔ حکمرانوں کا کردار انصاف قائم کرنا' عوام کی حفاظت کرنا' اور امن وامان برقرار رکھنا ہے۔ علماء کا

کردار لوگوں کو دین سکھانا' اہم مسائل پر رہنمائی کرنا' صحیح اور غلط کے درمیان فرق بتانا ہے۔ عام مسلمانوں کے کردار میں حکمرانوں اور علماء کی اطاعت کرنا (جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں) اور معاشرے کی ترقی کے لیے اپنی صلاحیتیں استعمال کرنا شامل ہے۔ از روئے قرآن' اطاعت کا دائرہ کار مسلم معاشرے میں بتدریج نظر آنا چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝۵۹﴾ (النساء)

"اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی بہت مفید ہے۔"

(۱۱) عبرت کی نگاہ رکھنے والے (اولو الابصار)

تاریخ نے اقوام کے عروج وزوال کے باب میں بہت سا مواد اخذ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اقوام کیسے ڈوبتی ہیں اور کن عوامل کی بنا پر ان کو زندگی اور عروج حاصل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے تاریخ کے ذریعے اُمتِ مُسلمہ کی بہت سے معاملات میں رہنمائی کی ہے۔ سابقہ اُمتیں کیسے ناکام ہوئیں؟ انبیاء کی دعوت کے اثرات ان معاشروں میں کیسے پھیلے؟ کون لوگ انبیاء کے حریف بن کر آئے؟ تلاوت کے دوران ہمیں ذرا توقف کر کے قرآن کی اس صدا پر غور کرنا چاہیے کہ ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴾ (النساء) "کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟" یا ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝۲۴﴾ (محمد) "کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑ چکے ہیں!" پورے قرآن میں کہیں بھی یہ موجود نہیں کہ قرآن کی تلاوت یا قراءت ہی کافی ہے۔ ان آیات پر تدبر کے لیے ضروری ہے کہ انسان تاریخ کی روشنی میں اپنی آنکھ میں وہ صلاحیت پیدا کرے جو "عبرت" حاصل کر سکے۔ دیکھتا تو ایک جانور بھی ہے لیکن قرآن کو وہ آنکھ مطلوب ہے جو بصارت سے بڑھ کر بصیرت کی حامل ہو۔ بصیرت بہت کم لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ بصارت آنکھوں کی ظاہری روشنی ہے' جبکہ بصیرت وہ کامل ہدایت ہے جو مِن جانب اللہ ہوتی ہے۔ بصیرت خدا کی خاص عطا ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتی۔ بہت سے لوگ

ساری زندگی کلام و بیان، بحث و مناظرہ اور عقل و منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں الجھے رہتے ہیں مگر بصیرت کے مقام تک نہیں پہنچ پاتے۔

﴿وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝۴۵﴾ (ص)

''اور تذکرہ کیجیے ہمارے بندوں ابراہیم' اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کا' جو قوت والے اور بصیرت والے تھے۔''

اہلِ بصائر ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے کے معاشی' معاشرتی' روحانی' اخلاقی مسائل کا ادراک کریں۔ سابقہ اقوام کے واقعات وقصص پر عبرت کی نگاہ سے اپنے معاشرے کو ان رذائل سے بچائیں جو زوال کا سبب بنتے ہیں۔

(۱۲) صاحبِ عزیمت لوگ

ایک اور قابلِ قدر قرآنی اصطلاح ''اولوا العزم'' (صاحب عزیمت) ہے۔ اوپر بیان کردہ صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے لیے جو لفظ بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے وہ ہے عزیمت۔ عزم کے عام معنی میں تہیہ' پختہ ارادہ' ضبط وتحمل شامل ہیں۔ عَزَمَ الْأَمْرَ وعَلَيه یعنی کسی کام کا تہیہ کرنا' ٹھان لینا' کوشش کے ساتھ لگ جانا' پختہ ارادہ کرنا۔ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام میں پانچ اولوالعزم پیغمبر ہیں اسی طرح مسلمانوں کی تاریخ میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے' جنہوں نے اسلام میں درآنے والی ہر فکری کج نظری کو پوری طاقت سے ردّ کیا' چاہے اس کے لیے انہیں جان دینی پڑی یا پسِ زنداں رہنا پڑا۔ اس حوالے سے بڑی فہرست سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں موجود ہے' جو قابل قدر ہے۔ حقیقتاً یہی وہ لوگ ہیں جو رع ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے برعکس چلے۔ دریا کی لہروں کے مخالف تیرے' بزدلی کے مقابلے میں بہادری و جرأت سے لڑے۔ ظلم و جبر کی آندھیوں کو ''تقدیر گردش'' سمجھ کر سمجھوتا نہیں کیا بلکہ ''گردشِ ایام'' کے نظریہ پر قائم رہے۔ وقت کے جابر کے ''دشنام'' کو ''اکرام'' خیال کرتے رہے۔ زمانے کی طعن زنی اور حرفِ ملامت کو بھی ''مسکرا'' کر سہتے رہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن ''صاحبِ عزیمت'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ

الْفٰسِقُوْنَ ۝۳۵﴾ (الاحقاف)

''تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولؑ صبر کرتے رہے ہیں اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے! جس دن یہ لوگ دیکھیں گے اُس (عذاب) کو جس کی انہیں وعید سنائی جا رہی ہے (تو ایسے محسوس کریں گے) گویا نہیں رہے تھے (دنیا میں) مگر دن کی ایک گھڑی۔ یہ پہنچا دینا ہے! تو کیا سوائے نافرمان لوگوں کے کوئی اور بھی ہلاک کیا جائے گا؟''

مطالعہ قرآن کرتے وقت کبھی ان ہستیوں کو اپنے ذہن میں لائیں کہ آج ''عزیمت'' کا لفظ ہماری زندگی سے خالی ہے۔ ''رخصتوں'' کے ہار اپنے گلے میں ڈالے ہم ''اللہ اللہ'' کرتے ہیں مگر یہ پکار نہ تو ہمارے اپنے گلے سے اُترتی ہے اور نہ ہی ہمارے عمل میں ڈھلتی ہے۔ مزید یہ کہ نہ ہی زمانے میں کوئی تبدیلی لاتی ہے۔ حقیقتاً وہ سجدہ جو قرآن کو مطلوب ہے' اس سے ہماری پیشانی محروم ہو چکی ہے۔

(۱۳) تاریخ سے سبق حاصل کرنے والے (کامل العقل)

قرآن کریم میں ایک بہت اہم اصطلاح ''أُولِي النُّهٰى'' استعمال ہوئی ہے۔ نُهٰى بمعنی کسی چیز کی انتہا کو پہنچنا۔ نَهُوَ يَنْهُو نَهَاوَةً: بہت زیادہ ذہین ہونا' کامل العقل ہونا۔ نُهيَة کا معنی عقل ہے' جس کی جمع نُهٰى ہے۔ اُولُو النُّهٰى یعنی صاحبِ فراست لوگ' بات کی تہ تک پہنچنے والے لوگ' تیز فہم لوگ۔ انسانی تاریخ قرآن کا ایک بڑا موضوع ہے۔ سابقہ اقوام کے عروج و زوال اور ان کی ناکامی و کامیابی کے عنوانات کو اُمّتِ مُسلمہ کے لیے بطور نشانِ عبرت بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ ہمیں پوری طرح ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہیں جس طرح سابقہ اقوام کے ضمن میں جاری تھے۔ ہماری تاریخ ابن خلدون' طبری' حافظ ابن کثیر جیسے مورخین سے بھری پڑی ہے' جنہوں نے قابلِ قدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ قرآن بھی اقوام کے ضمن میں ''اَيَّامُ اللّٰهِ'' کی شاندار اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ ان اقوام کے مذہبی' معاشی' معاشرتی' سیاسی جرائم پر نظر ڈالی گئی ہے' جو ان کے زوال کے سبب بنے۔ بڑی اُمتوں میں قومِ نوح' قومِ لوط' قوم ہود اور یہودیوں کی تاریخ انتہائی تفصیل سے بیان کی گئی ہے تاکہ اُمّتِ مُسلمہ ان جیسی غلطیوں اور بے اعتدالیوں سے خود کو بچائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَفَلَمۡ یَهۡدِ لَهُمۡ کَمۡ اَهۡلَکۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾﴾ (طٰہٰ)

’’تو کیا انہیں اس بات سے کوئی راہنمائی نہیں ملی کہ ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو‘ وہ بھی چلتے پھرتے تھے (اسی طرح) اپنی آبادیوں میں۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے۔‘‘

اب کچھ ان افراد کا ذکر ہو جائے جن کو معاشرتی ذمہ داریوں سے استثناء دیا گیا ہے۔ ان کو اگرچہ مکمل طور پر معاشرے سے نکالا تو نہیں گیا مگر درجے کے اعتبار سے تنزلی کے حامل افراد میں بدل دیا گیا ہے۔

ذمہ داریوں سے استثناء کی صورت

﴿لَا یَسۡتَوِی الۡقٰعِدُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ غَیۡرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالۡمُجٰهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِیۡنَ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ دَرَجَةً ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِیۡنَ عَلَی الۡقٰعِدِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۹۵﴾﴾ (النساء)

’’برابر نہیں ہیں اہلِ ایمان میں سے بیٹھ رہنے والے بغیر عذر کے اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد (قتال) کے لیے نکلتے ہیں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ۔ اللہ نے فضیلت دی ہے اُن مجاہدین کو جو اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے جہاد کرنے والے ہیں بیٹھے رہنے والوں پر‘ ایک بہت بڑے درجے کی۔ (اگرچہ) سب کے لیے اللہ کی طرف سے اچھا وعدہ ہے‘ لیکن فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں پر ایک اجر عظیم کی (صورت میں)۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ یُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبۡهُ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۷﴾﴾ (الفتح)

’’ہاں کسی اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ ہی کسی لنگڑے پر اور نہ ہی کسی مریض پر کوئی تنگی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو وہ داخل کرے گا اس کو ان

باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اور جو کوئی پیٹھ پھیر لے تو اُسے وہ ایک دردناک عذاب سے دوچار کرے گا۔‘‘

مطالعہ قرآن کریم سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں مثبت کردار ادا کرنے کے لیے ’’تقویٰ‘‘ کے ساتھ ’’صلاحیت‘‘ بھی ضروری ہے۔ دورِ نبویؐ ہی وہ ’’شفاف چشمہ‘‘ ہے جہاں ہم تقویٰ اور صلاحیت کو ایک ساتھ پروان چڑھتے دیکھتے ہیں۔ کم و بیش دو سو سے اڑھائی سو سال تک یہ کیفیت رہی۔ اس کے بعد دوسری اقوام سے ملاپ اور ان کے نظریات کی آمیزش نے اس شفاف چشمے کو گدلا کر دیا۔ علامہ ابن جوزی اپنی کتاب ’’صید الخاطر‘‘ میں کہتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ ’’شفاف چشمے‘‘ سے فیض یاب ہو اور ’’گدلے پانی کے تالاب‘‘ سے خود کو بچائے۔

حاصل مطالعہ یہ ہے کہ مسلمان قرآن کا مطالعہ کرتے وقت اپنی ذمہ داریوں پر بھی توجہ دیں۔ اپنی حیثیت کو معاشرے کی اصلاح و بھلائی کے لیے استعمال کریں۔ جس طرح ہم دنیاوی معاملات میں اپنے آپ کو پست و حقیر کہلانا نہیں پسند کرتے اسی طرح دین میں بھی درجہ بدرجہ ترقی کریں اور ’’وَاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا‘‘ کے منصب تک پہنچیں۔ ❁❁❁

ایک اہم اطلاع

❁ مکتبہ خدام القرآن لاہور سے کتب اور جرائد کی خریداری کے لیے یا کسی قسم کی شکایت کی صورت میں ان واٹس ایپ نمبرز پر رابطہ کیجیے:

ہفت روزہ ندائے خلافت‘ ماہنامہ میثاق‘ سہ ماہی حکمت قرآن : 0341-4941212

کتب : 0301-1115348

❁ ادائیگی کے لیے صرف درج ذیل بینک اکاؤنٹ ہی میں رقم ارسال فرمائیں اور سکرین شاٹ کے ذریعے اس کی اطلاع بھی ضرور کیجیے کہ اسے کس مد میں ارسال کیا گیا ہے:

Dubai Islamic Bank

Account Title : Markazi Anjuman Khuddam Ul Quran (Maktaba)
Branch Code : 010
Branch Name : Peco Road,Lahore
IBAN : PK17DUIB0000000062871003

از: منیجر‘ مکتبہ خدام القرآن‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور

منہجِ انقلابِ نبویؐ اور خدمتِ خلق

امیر تنظیم اسلامی شجاع الدین شیخ

سوال: تنظیمِ اسلامی منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ پر عمل کا دعویٰ کرتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے تو انسانیت کی فلاح و بہبود کا سبق بھی ملتا ہے' لیکن یہ تنظیمِ اسلامی کی ترجیحات میں کیوں شامل نہیں ہے؟

جواب: اسلام خدمتِ خلق اور خدمتِ انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ مغرب کے سوشل ویلفیئر کے تصور سے بہت پہلے اسلام نے انسانیت کی خدمت کے حوالے سے نہ صرف عظیم مثالیں قائم کیں بلکہ اعلیٰ تعلیمات بھی دی ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا' یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا' مسافروں اور محتاجوں کی ضروریات کا خیال رکھنا' کمزور اور ضعیفوں کا سہارا بننا' یہ سب وہ خدمات ہیں جن کا قرآن اور حدیث میں بار بار حکم دیا گیا ہے۔ مسلم شریف میں حدیثِ قدسی ہے کہ روزِ محشر اللہ تعالیٰ بندے سے فرمائے گا: اے میرے بندے! میں بھوکا تھا' تُو نے مجھے کھلایا نہیں' میں پیاسا تھا' تُو نے مجھے پلایا نہیں' میں بیمار تھا' تُو نے میری عیادت نہ کی اور میں بے لباس تھا تُو نے مجھے لباس نہ دیا؟ بندہ عرض کرے گا: اے اللہ! تُو ربّ العالمین ہے' تجھے اِن باتوں کی کیا حاجت ہے؟ اللہ فرمائے گا: میرا فلاں بندہ بھوکا تھا' پیاسا تھا' بے لباس تھا' بیمار تھا۔ تُو نے اُسے کھلایا ہوتا پلایا ہوتا' عیادت کی ہوتی' لباس دیا ہوتا تو مجھے پالیتا۔

انسان تو بڑی بات' اسلام جانوروں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ احادیث میں ذکر ہے کہ کُتے کو پانی پلانے کی وجہ سے ایک عورت کی مغفرت کر دی گئی اور ایک بلی کو روکے رکھنے اور اس کے بھوکا مر جانے کی وجہ سے ایک عورت کو جہنم کی سزا ملی۔

مغرب کا تصورِ خدمتِ خلق صرف اس مادی دنیا تک محدود ہے جب کہ اسلام سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتا ہے کہ لوگوں کو جہنم کی آگ سے آزاد کیا جائے۔ بخاری شریف میں وارد

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! تمہارا حال یہ ہے کہ تم جہنم کی آگ میں گرنے کے لیے بھاگے جا رہے ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر اس آگ سے بچانا چاہتا ہوں۔'' مغرب صرف جسم اور ظاہر کو دیکھتا ہے لیکن اسلام روح اور باطن کی فلاح بھی چاہتا ہے۔ سب سے بڑھ کر روح کے بارے میں فکرمند ہونا ضروری ہے۔ قرآن میں یہ نہیں کہا گیا کہ بچوں کے لیے گھر بناؤ' گرمی لگے تو اے سی چلاؤ' بھوک لگے تو کھانا کھلاؤ' کیونکہ اس دنیا میں تو ایک چڑیا بھی اپنے بچوں کو پال لیتی ہے' ان کے لیے گھونسلا بنا لیتی ہے۔ اس لیے قرآن میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی آخرت کو بچانے کی فکر دلائی گئی ہے:

﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶)

''بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (جہنم کی) آگ سے۔''

اللہ کے رسول ﷺ غریبوں کی مدد بھی کرتے تھے' یتیموں اور مسکینوں کا خیال بھی رکھتے تھے' بوڑھی اور ضرورت مند خواتین کے گھر جا کر ان کے کام بھی کرتے تھے' تجارت سے جو منافع حاصل ہوتا اُسے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے لیکن جب اللہ کا حکم آ گیا کہ:

﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ (المدثر)

''(اے نبی ﷺ!) اٹھو اور (لوگوں کو) خبردار کرو۔ اور اپنے رب کو بڑا کرو!''

اس کے بعد آپ ﷺ نے تجارت بھی چھوڑ دی اور اپنا سارا وقت دین کی دعوت اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں صرف کیا۔ انفرادی سطح پر خدمتِ خلق کے کام بھی جاری رہے لیکن سب سے بڑھ کر جو فریضہ انجام دیا وہ لوگوں کو جہنم کی آگ سے آزاد کروانا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اِس کے بعد دنیا میں عدلِ اجتماعی کا نظام قائم کرنا ہے تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر رب کی بندگی کی طرف لایا جائے۔

عدل کا نظام قائم ہو گا تو لوگوں کو جینے کا حق ملے گا۔ دنیا اس کی برکات دیکھنا چاہے تو خلافتِ راشدہ کی تاریخ کا مطالعہ کر سکتی ہے۔ خصوصاً حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں وہ مثالیں قائم ہوئیں جن کی پیروی آج مغرب بھی کر رہا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ دریائے فرات کے کنارے ایک کُتا بھی بھوک سے مرگیا تو عمرؓ سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ایک بوڑھا یہودی بھیک مانگتا ہوا دیکھا تو آپؓ نے اُس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور فرمایا

که جب تم جوان تھے تو کما کر ریاست کو بھی دیتے تھے' آج تم ضعیف ہو تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ تمہاری کفالت کرے۔ سکینڈے نیوین ممالک میں ''عمرلاز'' کے نام سے آج بھی قوانین نافذ ہیں۔ لہٰذا خدمتِ خلق کا اصل پیکج اسلام کے پاس ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ایک کتاب ''خدمتِ خلق کا قرآنی تصوّر'' کے عنوان سے شائع ہوتی ہے۔ اسی عنوان سے ڈاکٹر صاحب کا خطاب بھی موجود ہے: (https://youtube/VmX5zkf5E7o)

اس خطاب میں انہوں نے بہترین مثال پیش کی ہے کہ فرض کریں کسی بستی پر توپ کے گولے برسائے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ۵۰ لوگ مرجاتے ہیں' ۵۰ زخمی ہو جاتے ہیں' لوگ انسانی ہمدردی کے تحت زخمیوں کو ہسپتال پہنچاتے ہیں' متاثرین کی مدد کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پھر توپ کے گولے برسائے جاتے ہیں اور لوگ زخمیوں کو ہسپتال پہنچاتے ہیں' مُردوں کو دفناتے ہیں اور متاثرین کی مدد کرتے ہیں۔ تیسری مرتبہ پھر یہی ہوتا ہے۔ پھر ایک سیانے نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ پہاڑ پر چڑھ کر گولے برسانے والوں کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ بستی میں امن ہو۔ اصل خدمت یہ ہوگی۔ اسی طرح آج ہزاروں تنظیمیں ہیں' این جی اوز ہیں جو فلاحی کام کر رہی ہیں' لیکن عدل کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو انصاف نہیں مل رہا۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ ظلم و جبر کا راج ہے۔ جب تک اس نظام کو تبدیل نہیں کیا جائے گا' لوگوں کو جینے کا حق نہیں ملے گا۔ لہٰذا انسانیت کی سب سے بڑی خدمت باطل نظام کا خاتمہ کرنا ہے۔

تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے ہمیں جب موقع ملتا ہے تو حسبِ توفیق خدمتِ خلق کے کام بھی کرتے ہیں۔ زلزلہ اور سیلاب متاثرین کے لیے' غزہ کے مسلمانوں کے لیے اور اکثر قدرتی آفات کے مواقع پر اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ نظامِ عدل کے لیے جدّوجہد کرنا تنظیم اسلامی کا اولین ہدف ہے' اور یہی درس ہمیں منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ سے ملتا ہے کہ انفرادی سطح پر خدمتِ خلق کے کام کیے جائیں لیکن اجتماعی سطح پر نظامِ عدل کے قیام کے لیے جدّوجہد کی جائے تاکہ عادلانہ نظام قائم ہو۔

❁❁❁

الدِّیْنُ یُسْرٌ

ڈاکٹر ربیعہ ابرار

اللہ عزّوجل نے اپنے آخری نبی ﷺ کے ساتھ جو دین تمام بنی نوعِ انسان کے لیے تاقیامت منتخب فرمایا' اس کے بارے میں یہ قرار دیا کہ:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟﴾ (آلِ عمران:۱۹)

''بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔''

اس دین کو اللہ ارحم الراحمین نے آسان اور سہل بنایا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی ۝۸﴾ (الاعلیٰ)

''اور ہم آپ کو آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''

''یُسْرٰی'' مبالغہ کا صیغہ ہے' جس کا معنی بنتا ہے: سب سے زیادہ آسان۔ یعنی اللہ عزوجل سب سے آسان راستے کے لیے بھی مزید آسانی کا وعدہ فرما رہے ہیں۔ یہاں یُسْرٰی سے مراد اسلام اور شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے' جس کی تائید ہمیں ایک حدیث مبارکہ سے ملتی ہے۔ فرمانِ مصطفی ﷺ ہے:

((اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ)) (صحیح البخاری:۳۹)

''بے شک دین آسان ہے۔''

اسلام ہر زمانے کے تمام افراد کے لیے زندگی کے ہر مرحلے میں قابلِ عمل اور مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ موجودہ دور میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد' جن میں مسلمان بھی شامل ہیں' یہ کہتی نظر آتی ہے کہ اب جبکہ انسانی معاشرہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بل پر ترقی کی نئی منزلیں طے کر رہا ہے' اسلام پر عمل کرنا مشکل اور کسی درجے میں ناممکن ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم اسلام کی لائی ہوئی آسانیوں کا جائزہ لیں گے اور اس حقیقت پر غور کریں گے کہ اسلام نہ صرف بطور دین عمل کے لیے آسان ہے بلکہ اپنے پیروکاروں کی زندگی کو بھی سہل بناتا ہے۔

گزشتہ مذاہب سے موازنہ

اسلام کا موازنہ اگر سابقہ آسمانی مذاہب سے کیا جائے تو یہ ان سب میں آسان‘ معتدل اور عقل و دلائل سے ثابت ہونے والا دین ہے۔ اس میں نہ رہبانیت ہے‘ نہ کسی Original Sin کا تصور کہ جس کے تحت ایک معصوم نومولود بھی گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ اسلام سابقہ شریعتوں میں موجود مشکل احکام اور پابندیوں کو بھی دور کرتا ہے جو کہ یہود کے بعض اعمال کی وجہ سے ان پر لاگو ہوئی تھیں۔ قرآن کریم (الاعراف: ۱۵۶‘ ۱۵۷) کے مطابق تورات اور انجیل میں نبی ﷺ کی جو خصوصیات ذکر کی گئی تھیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ پاکیزہ چیزوں کو حلال بناتے ہیں‘ گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق ہیں ان کو دور کرتے ہیں۔ اس میں بعض ان چیزوں کو حلال کرنا بھی شامل ہے جو یہود کی برائیوں کے سبب حرام کر دی گئی تھیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیروی میں خود ان کے بعض حلال کو حرام کی طرح ترک کر دینا بھی شامل ہے (جن کا ذکر آلِ عمران: ۹۳‘ النساء: ۱۶۰ اور الانعام: ۱۴۶ میں آتا ہے)۔ یہود میں آج تک بھی کھانے پینے کے معاملات سخت ہیں‘ جیسے کہ وہ دودھ اور گوشت کو اکٹھا نہیں کر سکتے۔ پھر بعض جانور کُلّی طور پر ان پر حرام ہیں‘ جیسے ایک ناخن والے جانور یعنی شتر مرغ‘ قاز‘ بط وغیرہ۔ اس کے علاوہ اُونٹ‘ خرگوش اور سافان بھی حلال نہیں۔ گائے اور بکری کی چربی (مخصوص حصوں کی) بھی ان کے لیے ممنوع ہے۔ ذبیحہ کے معاملات میں بھی سختی ہے‘ جیسے خون کو مکمل طور پر شدت کے ساتھ صاف کرنا ضروری ہے۔ جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کی عرق النساء کو بھی الگ کرنا بھی ضروری ہے‘ جو کہ ایک دشوار عمل ہے۔ مسلمانوں کے لیے ذبیحہ کے بھی واضح احکام دیے گئے ہیں اور ان میں جانور کے ساتھ احسان کا معاملہ اور ذبح کرنے والے کے لیے آسانی کا پہلو ہے۔

سبت جو یہود کی عبادت کا دن تھا‘ اس میں ان پر کام کاج منع تھا جبکہ مسلمانوں کو جمعہ کے دن عبادت کے بعد تجارت کی آزادی ہے (الجمعہ: ۱۰)۔ روزے کے معاملے میں بھی یہود کے ہاں تقریباً پچیس گھنٹے کا روزہ ہوتا ہے جس میں کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات کے علاوہ نہانے‘ خوشبو لگانے اور چمڑے کے جوتے پہننے کی بھی پابندی ہے۔ نصاریٰ میں روزوں کا کوئی باضابطہ طریقہ رائج نہیں۔ الگ الگ مسلکوں کے اپنے دن اور طریقے ہیں۔ مکمل بھوک پیاس کا تصور نہ

ہونے کے برابر ہے‘ یعنی روزے سے کوئی حقیقی فائدہ ملنا ممکن نہیں۔ مسلمانوں کو عطا کردہ روزوں میں بھوک کا عنصر طبی اور روحانی تربیتی پہلو لیے ہوئے ہے اور افطار کے کشائش والے اوقات آسانی کا پرتو ہیں (البقرہ: ۱۸۷)۔ یہود کے ہاں کسی قتل کے جرم کے بدلے صرف قتل کی سزا تھی (سنن النسائی: ۴۷۸۵) اور نصاریٰ میں صرف معافی کی گنجائش‘ جبکہ اسلام میں قتلِ خطا کے بدلے سزا کا بھی حق ہے‘ دیت کی سہولت بھی اور فی سبیل اللہ معاف کرنے کا بھی اختیار ہے۔ یہ مختلف انتخاب آسانی کے سوا اور کیا ہیں!

پیغمبر اسلام ﷺ

محض دیگر ادیان سے مقابلے پر ہی نہیں‘ اسلام اپنے آپ میں بھی ہر ہر پہلو میں آسانیاں اور خیر لیے ہوئے ہے۔ یہ جس پیغمبر کے توسط سے انسانیت کو عطا ہوا‘ وہ ہادیٔ اعظم رحمۃٌ للعالمین بنا کر بھیجے گئے۔ وہ اپنی ذات میں بھی سراپا شفقت‘ آسانیاں پیدا کرنے والے اور آسانیوں کو پسند فرمانے والے تھے۔ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ’’رسول اللہ ﷺ سے جب بھی دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے لیے کہا گیا تو آپؐ نے ہمیشہ اسی کو اختیار فرمایا جس میں زیادہ آسانی معلوم ہوئی بشرطیکہ اس میں کوئی گناہ نہ ہو۔‘‘ (بخاری: ۳۵۶۰)

رسول اللہ ﷺ کے کامل اخلاق اور اسوہ حسنہ کا ایک جزو وہ آسانی بھی تھی جو آپ ﷺ دوسروں کے لیے پیدا فرمایا کرتے تھے۔ خود نبی ﷺ نے اپنے متعلق فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّتًا، وَ لَا مُتَعَنِّتًا، وَ لٰكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا)) (مسلم: ۴۷۸۱)

’’اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی کرنے والا اور لوگوں کے لیے مشکلات ڈھونڈنے والا بنا کر نہیں بھیجا‘ بلکہ تعلیم دینے والا اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حکومتی و انتظامی امور کے لیے یمن بھیجا۔ اس موقع پر یہ ہدایت فرمائی کہ:

((يَسِّرَا وَ لَا تُعَسِّرَا، وَ بَشِّرَا وَ لَا تُنَفِّرَا، وَ تَطَاوَعَا وَ لَا تَخْتَلِفَا)) (بخاری: ۳۰۳۸‘ مسلم: ۴۵۲۶)

’’(لوگوں کے لیے) آسانی پیدا کرنا‘ انہیں سختیوں میں مبتلا نہ کرنا‘ ان کو خوش رکھنا‘ نفرت نہ دلانا‘ اور تم دونوں آپس میں اتفاق رکھنا‘ اختلاف نہ پیدا کرنا۔‘‘

نہ صرف قولی تعلیم میں بلکہ آپ ﷺ کے عمل میں بھی لوگوں کے لیے یہی تعلیم تاباں تھی کہ ہر طرح کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو‘ سختی سے بچا جائے۔ معروف واقعہ ہے کہ جب ایک بدوی نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیا اور لوگ اسے پکڑنے کے لیے بڑھے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((دَعُوْهُ وَاَهْرِيقُوا عَلٰى بَوْلِهٖ دَلْوًا مِنْ مَاءٍ، فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ)) (نسائی:۵۶)

’’اسے چھوڑ دو (فارغ ہونے دو) اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہا دو۔ تمہیں نرمی اور آسانی کرنے والے بنا کر بھیجا گیا ہے‘ نہ کہ سختی اور تنگی کرنے والے۔‘‘

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ، وَ لَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ، فَسَدِّدُوا وَ قَارِبُوا، وَ اَبْشِرُوا، وَ يَسِّرُوا، وَ اسْتَعِيْنُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ، وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ)) (بخاری:۳۹‘ نسائی:۵۰۳۸)

’’دین آسان ہے۔ جو شخص دین کو سخت بنائے گا‘ دین اس پر غالب آ جائے گا‘ لہٰذا تم اپنے اعمال درست رکھو‘ میانہ روی اختیار کرو‘ لوگوں کو بشارت دو اور اُن کے لیے آسانی پیدا کرو۔ اور صبح و شام اور کسی قدر رات میں (نماز کے ذریعے) مدد حاصل کرو۔‘‘

دراصل نبی ﷺ کو تو مبعوث ہی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ جانتے ہیں کہ جب وہ قرآن کی شرح احادیث سے کرتے ہیں اور سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلام کی اصل وسعت‘ خوب صورتی اور آسانی ان پر آشکار ہوتی ہے۔ یعنی یہ آسان دین نہ صرف اللہ کا کرم ہے بلکہ اس کے محبوب ترین نبی ﷺ کی شخصیت کا اعجاز اور معاملات میں آسانی کی طرف رجحان کا ثمرہ بھی ہے۔

صحیفۂ اسلام

نبی کے بعد اگر اُس کے لائے ہوئے دین کو کوئی چیز زندہ رکھتی ہے تو وہ اس عقیدے کی کتاب ہوتی ہے۔ اسلام کا آسمانی نسخہ یعنی قرآن کریم ربّ تعالیٰ کا کلام بھی ہے اور نبی ﷺ کا تا قیامت زندہ معجزہ بھی۔ بَیْنَ الدُّفَّتَیْنِ (دو گتوں کے درمیان) موجود کہنے کو یہ ایک کتاب ہے‘

مگر ایمان والوں کے لیے کیا کچھ نہیں ہے۔ شفا‘ تذکرہ‘ یاد دہانی‘ نصیحت‘ فرقان‘ ہدایت‘ نور‘ تزکیہ یعنی کہ یہ ہر وہ شے ہے جو اس مادہ پرست دنیا میں انسان کو دنیا اور اصل زندگی (آخرت) کے درمیان توازن رکھنے میں معاون ہے۔ دنیا اپنی آرائش اور فریب کے ساتھ انسان کو بہکانے‘ بھٹکانے اور اندھا بنا دینے کے لیے ہر لحظہ سرگرم ہے۔ یہ انسان کو اس کے اصل مقصد سے ہٹا کر اور عبودیت کے مقام سے پھسلا کر ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝۳۰﴾ (ق) ’’کیا کچھ اور بھی ہے؟‘‘ کی دلدل میں یوں دھنساتی چلی جاتی ہے کہ پھر موت سے قبل کوئی چیز اسے جگا نہیں پاتی۔

قرآن جو انسان کو آخرت کی یاد دلاتا ہے‘ دراصل اس کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے۔ دنیا کو کتنا مرتبہ دینا ہے اور کیسے اس کو دل میں سمانے سے بچانا ہے‘ یہ سکھا کر وہ اس زندگی کو بھی آسان بناتا ہے۔ بندۂ مؤمن کبھی اس کتاب کو رحمتِ رحمان کے حصول کے لیے کھولتا ہے‘ تو کبھی کوئی آیت اس کے دکھی دل کے لیے مرہم بن جاتی ہے۔ یہ اندھیروں میں امید بھی ہے اور بیمار دلوں کے لیے شفا بھی۔ یہ کتاب برکت لاتی ہے اور اپنے قاری کی زندگی کو خیر اور آسانیوں سے بھر دیتی ہے۔ دنیا کی مثال اگر کسی راستے سے لی جائے تو اس کے گڑھے اور خطرات ظاہر نہیں بلکہ چھپے ہوئے اور آرائشوں کے لبادے اوڑھے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ ازلی دشمن شیطان جو نسل در نسل دشمنی نبھا رہا ہے‘ وہ بھی اس راستے کی ہر جہت پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ایسے میں قرآن وہ گائیڈ بک ہے جو اس دنیا کے مسافر کو آسانیوں کی راہ دکھاتی ہے‘ اسے درست سمت رواں رکھتی ہے اور شیطان کے وار سے بھی باخبر کرتی ہے۔ اگر انسان کے لیے ایک مشین سے استعارہ لیا جائے تو قرآن حکیم اس کا manual ہے جو اسے خود اُس کی ذات سے بھی متعارف کراتا ہے‘ اُس کے وجود میں چھپے اسرار اور نشانیوں کے بھید کھولتا ہے اور اپنی صلاحیتوں سے بہترین فائدہ اٹھانے میں معاون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا موضوع انسان ہی ہے۔ پھر کرم در کرم یہ ہے کہ اس قدر متاثر کن قرآن کو سیکھنے‘ نصیحت لینے کے لیے آسان بنایا گیا ہے۔ اس کی تلاوت آسان کی گئی ہے۔

اللہ عزوجل فرماتے ہیں: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ﴾ (المزمل:۲۰) ’’جتنا قرآن پڑھنا تمہارے لیے آسان ہو‘ اتنا ہی پڑھو۔‘‘ سورۃ القمر میں چار مرتبہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ’’اور یقیناً ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان بنا دیا ہے‘ تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟‘‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب تم میں

سے کوئی رات کو اٹھ کر نماز پڑھے اور پھر قرآن کو اپنی زبان پر بھاری محسوس کرنے لگے‘ اسے معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے تو چاہیے کہ سو جائے۔’’ فرض نماز میں بھی آسانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں نماز میں سورۃ الفاتحہ اور جو سورت آسانی سے پڑھ سکیں‘ اس کی تلاوت کرنے کا حکم دیا ہے۔ (مسند احمد: ۱۱۴۳۵)

اس کے برعکس دین کو مشکل بنانے پر سخت تنبیہہ فرمائی گئی ہے۔ صحابہ کرام ؓ سب سے زیادہ قرآن کو جاننے والے اور اس کی خیر کو سمجھنے والے تھے‘ لیکن جب آپ ﷺ کو خبر ملی کہ حضرت معاذ ؓ عشاء کی امامت میں بہت طویل قراءت کرتے ہیں تو ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

((يَا مُعَاذُ، أَفَتَّانٌ أَنْتَ))- أَوْ ((أَفَاتِنٌ))- ثَلَاثَ مِرَارٍ: ((فَلَوْ لَا صَلَّيْتَ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ، وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا، وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى، فَإِنَّهُ يُصَلِّي وَرَاءَكَ الكَبِيرُ وَ الضَّعِيفُ وَ ذُو الحَاجَةِ)) (بخاری: ۷۰۵، مسلم: ۱۰۴۰)

’’معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرنے والے ہو؟ آپ نے تین مرتبہ (فَتّان یا فَاتِن) فرمایا۔ تم نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ، وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (جیسی سورتیں) کیوں نہ پڑھیں؟ کیونکہ تمہارے پیچھے بوڑھے‘ کمزور اور حاجت مند نماز پڑھتے ہیں۔‘‘

توحید

اسلام کی عمارت جن پانچ بنیادی ارکان پر کھڑی ہوئی ہے‘ ان میں سے پہلا رکن اور وہ دروازہ جس سے اس دین کی عمارت میں داخل ہوا جاتا ہے‘ کلمہ شہادت ہے۔ قرآن کریم میں صراحت سے موجود ہے کہ اللہ پر ایمان لانا اور دین اسلام کو اختیار کر لینا ایک مضبوط کڑے کو تھام لینا ہے۔ (البقرۃ: ۲۵۶)

آج کی دنیا میں جدت کے نام پر ہر لحظہ ایک نیا فتنہ درپیش ہے۔ ایسے میں پاؤں جما کر کھڑے ہونے کو کوئی ایسی زمین جو قدموں کو تھام لے‘ انسان کو پھسلنے اور گرنے سے بچائے درحقیقت ایک قیمتی ترین نعمت ہے۔ اسلام وہ نورِ بصیرت ہے جو ایک نیا زاویۂ نگاہ نصیب کرتا ہے۔ انسان اپنے اطراف کے اندھیروں میں ایک نور لے کر چلنے لگتا ہے‘ جیسے تاریک رات

میں کوئی جگنو اپنا چراغ لے کر چلتا ہے۔ وہ روشنی نہ صرف اس کے راستے آسان کرنے لگتی ہے بلکہ لوگوں کے لیے بھی مشعل راہ بنتی ہے۔ اس دنیا میں انسان روز ایک نئے طوفان سے آشنا ہوتا ہے۔ ایسے میں اس دین کی تعلیمات کی مثال درخت کی اس ٹہنی کی سی ہے جو لچک دار ضرور ہے لیکن مضبوط بھی ہے۔ اس کو تھام کر ہلاک ہونے سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

عبادات

اسلام کا دوسرا رکن جو ہر عاقل بالغ مسلمان پر دن میں پانچ بار فرض ہے‘ نماز ہے۔ بظاہر نماز کی پابندی ایک عام انسان کو مشکل لگ سکتی ہے لیکن درحقیقت یہ انسانی روح کی اہم ترین ضروریات میں سے ہے۔ ایمانی زندگی کی خوراک ذکر اللہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ (طٰهٰ) ’’اور نماز قائم رکھو میری یاد کے لیے۔‘‘ امام ابن القیم لکھتے ہیں کہ اللہ نے نماز کو بندے کے لیے اپنے قرب‘ اپنے ساتھ مناجات‘ اپنی محبت اور اپنے سے مانوس ہونے کا سبب بنایا ہے۔ دو نمازوں کے درمیانی وقفے میں بندے سے غفلت و بداخلاقی‘ روگردانی‘ لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں جو اُسے اُس کے رب سے دور کر دیتی ہیں۔ وہ ایسے ہو جاتا ہے گویا عبودیت سے اجنبی ہوا اور اللہ کے بندوں میں شامل نہ ہو۔ چنانچہ اُس کے رب کی رحمت نے تقاضا کیا کہ وہ اس کے لیے اپنی عبودیت میں سے مختلف اجزاء اور حالات کی ایک جامع عبودیہ مقرر کر دے۔

انسان کے اندر ایک فطری ضرورت رکھ دی گئی ہے کہ اُس نے اپنی ذات سے بڑھ کر کسی اور ذات سے محبت کرنی ہے‘ اس کی پرستش کرنی ہے۔ اسی طلب کے پیش نظر ہی پانچ وقت کی نماز اس پر فرض کر دی گئی ہے۔ یہ نماز اسے دنیا کی جگمگاہٹوں اور اس کے جمگھٹوں سے نکال کر اس کے اصل کی طرف لے آتی ہے۔ جو شخص اصل آقا کی عبودیت سے نکل جاتا ہے‘ وہ نفس کا‘ مال کا‘ جاہ کا‘ جمال کا غلام بن جاتا ہے۔ چیزوں کے آنے کی آس اور جانے کا غم اس کی ذات پر چھائے رہتے ہیں۔ بہت اکٹھا کرنے کی آرزو میں وہ پاس موجود چیزوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھانے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ پھر زیست اور گزران تنگ ہونے لگتی ہے تو کبھی نیند کی گولیاں‘ کبھی سکون کا علاج ڈھونڈتا ہے۔ ان سب مشکلات کے حل کے لیے انسان کو نماز جیسی آسانی عطا کی گئی ہے۔ پانچ نمازوں کا ثواب ۵۰ کے برابر رکھا گیا کہ وہ ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو تو دل کا سکون

بھی پائے اور بیش بہا اجر بھی۔ پھر خاص مواقع سے جڑی خصوصی رعایت کی اپنی آسانی ہے۔ سفر میں قصر‘ جنگ میں صلاۃ الخوف‘ عذر والے کے لیے بیٹھ کر حتیٰ کہ لیٹ کر نماز پڑھنا بھی درست ٹھہرا۔ سہولت کے لیے بعض دفعہ نماز جمع کرنا بھی درست ہے۔ پانی میسر نہ ہو تو تیمم کی سہولت اور برکت بھی اللہ عزوجل نے سیدہ عائشہ صِدِیقہ ؓ کے صدقے اس اُمت کو عطا کر رکھی ہے۔ (بخاری:۴۶۰۸)

روزے بھی ہر بالغ مسلمان پر رمضان کے مہینے میں فرض کیے گئے ہیں۔ ان کا معاملہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے لیے کچھ روزے مقرر کیے گئے تھے‘ جیسے کہ دس محرم کا روزہ اور ہر ماہ ایامِ بیض کے روزے۔ حکم یہ تھا کہ روزے رکھنا بہتر ہے لیکن گنجائش تھی کہ روزے کے بجائے فدیہ دے دیا جائے۔ پھر سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۸۵ کے ذریعے فرما دیا گیا: ﴿فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ ؕ﴾ ”جو کوئی اس مہینے (رمضان) کو پائے اسے چاہیے کہ وہ روزے ہی رکھے“۔ یہ پہلے کی طرح سال کے مختلف دنوں میں چند روزے نہ تھے بلکہ پورے ایک مہینے کے روزے فرض کیے گئے۔ مہینہ بھی رمضان کا چنا گیا۔ اُس دور میں شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے رمضان عربوں کے ہاں گرم ترین مہینہ ہوا کرتا تھا۔ لغت میں رمضان کا معنیٰ ہی جھلسا دینے والی گرمی یا ایسی سوکھی زمین ہے جو پانی کی کمی کی وجہ سے تڑخ جائے۔ رمضان میں روزوں کی فرضیت کے بعد قمری تقویم اختیار کی گئی اور ماہِ رمضان سال کے مختلف موسموں میں آنے لگا۔

سطحی طور پر دیکھا جائے تو مہینے بھر کے روزے ایک دشوار معاملہ نظر آتا ہے‘ لیکن دراصل رمضان کا مقصد بندۂ مؤمن کی زندگی کو آسان کرنا ہے۔ جس طرح کسی بھی پروفیشنل تعلیم کے بعد تربیت دی جاتی ہے‘ مثلاً ایم بی بی ایس مکمل ہونے کے بعد ہاؤس جاب لازم ہوتی ہے‘ اسی طرح رمضان نفس کی تربیت کا مہینہ ہے۔ یہ بندۂ مؤمن کو باقی سال میں دین پر جمے رہنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ رمضان کا مقصد تقویٰ کا حصول ہے‘ جو آزمائشوں سے اٹی دنیا میں انسان کو دین پر قائم رہنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ ۡ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ”اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور مشکل نہیں چاہتا‘ اس لیے گنتی پوری کرو۔“ گنتی پوری کرو یعنی ٹریننگ مکمل کرلو‘ پھر آسانیاں

تمہاری منتظر ہیں۔ رخصتیں مزید آسانی کے پہلو لاتی ہیں کہ مریض‘ مسافر‘ حاملہ‘ رضاعت کرانے والی‘ حیض اور نفاس والی عورتیں دوسرے دنوں میں قضا ادا کر لیں۔ انتہائی ضعیف اور دائمی مریض کو فدیہ کی رخصت بھی دی گئی ہے۔ روزے دار جانتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ کچھ اپنا ہی فیض اور برکت رکھتا ہے۔ اس میں رکھے گئے روزے نفلی روزوں سے کہیں زیادہ آسان ہوتے ہیں۔ صرف روزے ہی نہیں‘ نیکی کا ہر کام آسان تر معلوم ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کا ذکر قرآن میں نماز کے ساتھ آتا ہے۔ صحابہؓ اور سلف صالحین زکوٰۃ کو نماز سے الگ نہیں سمجھتے تھے اور اسے نماز جتنی ہی اہمیت دیا کرتے تھے۔ یہ نہ صرف اللہ کے فرض کردہ احکام میں سے ہے بلکہ ایک فلاحی معاشرے کے قیام کے لیے بھی اس کی اہمیت اساسی ہے۔ مال کی اہمیت معاشرے میں اسی طرح ہے جیسے خون کی اہمیت جسم میں۔ خون جسم کے کسی ایک عضو تک نہ پہنچے تو وہ فالج زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مال بھی معاشرے کے ایک طبقے تک محدود ہو کر رہ جائے تو وہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ ایسے معاشرے میں ذہنی انتشار‘ جرائم‘ بدامنی الغرض ہر وہ شے ہو گی جو آسانی اور خوش حالی کی متضاد ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیتا ہے۔ اس میں آسانی کا یہ پہلو رکھا گیا ہے کہ سال میں محض ایک بار صاحب نصاب پر کُل مال کا صرف ڈھائی فیصد حصہ نکالنا لازم ہے۔ اس میں بھی استثناآت موجود ہیں‘ جیسے رہائش والا مکان اور زیر استعمال سواری‘ اس کے علاوہ کرسٹل کے قیمتی برتن اور ڈائمنڈ وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ماہرینِ معاشیات کا کہنا ہے کہ دنیا کے تمام امیر کبیر لوگ اگر اپنے کُل مال کا صرف ڈھائی فیصد غرباء میں تقسیم کر دیں تو پوری دنیا کی غربت دور کی جا سکتی ہے۔ ایک مؤمن خوش دلی سے زکوٰۃ ادا کرنے والا ہوتا ہے‘ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ مال نہ صرف اس دنیا میں لوگوں کی زندگی میں آسانی لائے گا بلکہ روزِ قیامت اس کا کنز اس کے گلے کا طوق نہیں بنے گا۔

زکوٰۃ کی طرح حج بھی آسانی کی خاطر صرف صاحب حیثیت افراد پر فرض ہے‘ اور وہ بھی عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ۔ اگرچہ حج کا تمام ہی سفر دشوار گزار اور اس کے ارکان تھکا دینے والے معلوم ہوتے ہیں لیکن جنہیں یہ سعادت نصیب ہوتی ہے وہ اسے زندگی بدلنے والا تجربہ قرار دیتے ہیں۔ اپنی لگی بندھی زندگی جیتے انسان اکثر غفلت کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ سفر انسان کو اس یکسانیت سے نکال لاتا ہے۔ یہ رکنِ عظیم سال بھر کے سب سے

عظمت والے دنوں میں دنیا کے ہر کونے سے ہر نسل کے مسلمانوں کو دنیا کی مقدس ترین جگہ پر اکٹھا کر کے ایک ربّ تعالیٰ کے آگے جھکا دیتا ہے۔ اُسی کے لیے تلبیہ اور تکبیر پڑھواتا ہے۔ اسلام کی شان اور اس دین کے ربّ کی عظمت کو دل پر ثبت کر دیتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں، میدانِ عرفات میں تو یہ اُس آخری دن کی تیاری بھی کرواتا ہے جس میں سب نے ہی اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ کسی بھی چیز کی تیاری اس کام کو کرنے کے لیے آسانی کے سوا اور کیا ہے! بار بار حج اور عمرہ کرنا فقر و فاقہ کو بھی دور کرتا ہے۔ عبادت کے اس سفر میں تجارت کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔

نفلی عبادات

نفلی عبادات کی بات کی جائے تو بھی اسلام کا مزاج معتدل اور بندے کے ساتھ آسانی کرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اصحاب نے جب عبادت کے معاملے میں خود پر مشقت کرنے کی ٹھانی تو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند فرمایا اور اپنی معتدل سنت کی طرف رہنمائی فرمائی (سنن نسائی:۳۲۱۹)۔ یہی معاملہ خرچ کا ہے۔ اس میں بھی اعتدال کو پسند کیا گیا ہے کہ اتنی فراخ دستی نہ ہو کہ انسان خود فقیر ہو جائے (الاسراء:۲۹)۔ اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے کو زیادہ پسند کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ آسانی ہی چاہتا ہے۔ اس کے خزانے لامحدود ہیں، کمزور ہم انسان ہیں۔ فرمانِ رسول اللہ ﷺ ہے:

((اكْلَفُوا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِيقُونَ، فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوا، وَإِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ))

(نسائی: ۷۶۳)

’’اتنے عمل کے شائق بنو جس کی آسانی کے ساتھ طاقت رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ (ثواب دینے سے) نہیں اکتائے گا حتیٰ کہ تم ہی اُکتا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے پسندیدہ کام وہ ہے جس پر ہمیشگی ہو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے آسانی اور اعتدال کی راہ کو چھوڑتے ہوئے خود پر نفلی روزوں اور نمازوں کی کثرت کی تو آخر عمر میں یہ شوق ان کے لیے دشواری کا باعث بن گیا۔ (صحیح مسلم:۱۱۵۹)

بندہ مؤمن کے ساتھ اس قدر شفقت برتی گئی ہے کہ اسے بے وجہ کے ہر تکلف سے بچا لیا گیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ لوگ بلند آواز سے اللہ اکبر پڑھنے لگے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ ارْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ، إِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلَا غَائِبًا، إِنَّكُمْ تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا وَهُوَ مَعَكُمْ، وَالَّذِي تَدْعُونَهُ أَقْرَبُ اِلٰى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ)) (متفق عليه)

’’لوگو! اپنے آپ پر آسانی کرو، کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے بلکہ تم تو سننے دیکھنے والی ذات کو پکار رہے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے، اور جس ذات کو تم پکارتے ہو وہ تو تمہاری سواری کی گردن سے بھی تمہارے زیادہ قریب ہے۔‘‘

صرف عبادات ہی میں نہیں، معاملات میں بھی آسانی کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے بجائے معاشرے میں عام کرنے کا شوق دلایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ؟ أَوْ بِمَنْ تَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارُ؟ عَلٰى كُلِّ قَرِيبٍ هَيِّنٍ سَهْلٍ)) (ترمذی:۲۴۸۸)

’’کیا میں تمہیں ایسے لوگوں کی خبر نہ دوں جو جہنم کی آگ پر یا جہنم کی آگ ان پر حرام ہے؟ جہنم کی آگ لوگوں کے قریب رہنے والے، آسانی کرنے والے، اور نرم اخلاق والے پر حرام ہے۔‘‘

اسی طرح ایک موقع پر فرمایا:

((وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ فِي الدُّنْيَا يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ))

(ترمذی:۱۹۳۰)

’’جس نے دنیا میں کسی تنگ دست پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اسے آسانی عطا فرمائے گا۔‘‘

ایک تاجر کا واقعہ احادیث میں وارد ہوتا ہے جس کے دنیا میں قرض خواہوں سے آسانی کی جزا میں اخروی معاملات میں آسانی برتی گئی۔ (مسلم:۱۵۶۰)

اسلامی حدود اور قوانین

اسلام کا وہ پہلو جس پہ سب سے زیادہ اعتراض اٹھائے جاتے ہیں وہ اسلامی قوانین اور

حدود کی سزائیں ہیں۔ کسی حکم کی افادیت سے نابلد اور ربّ العالمین کی حکمت پر توکّل نہ رکھنے والے ہی اسلام کے واضح احکام پر شور مچا سکتے ہیں۔ اسلام چوں کہ انسانیت کی بقا کے لیے اتارا گیا‘ لہٰذا یہ ہر اُس فعل کو حرام ٹھہراتا ہے اور اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کی جان‘ مال‘ عقل‘ ایمان یا نسب کے لیے خطرہ ہو۔ عقل کی حفاظت کے لیے شراب کو حرام کیا گیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے تعزیری سزا اسلامی حکومت نافذ کر سکتی ہے۔ عقل انسان کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر یہی مغلوب ہو جائے تو ہر وہ برائی جس کا انسان ہوش کی حالت میں تصور بھی نہ کرنا چاہے‘ سرزد ہو سکتی ہے۔

حد الحرابۃ اور سرقہ کی سزائیں بھی معاشرے سے فتنہ اور انتشار مٹانے کے لیے ہیں۔ عادی چور اور ڈکیت کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے چور کا بایاں ہاتھ اور ڈکیت کے مخالف سمت سے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں تاکہ آئندہ کوئی اس طرح کے جرم کا حوصلہ بھی نہ کرے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح کے قوانین کا بنیادی مقصد سزا دینا نہیں بلکہ جرم روکنا ہے۔ اس لیے ضروری قرار دیا گیا کہ اعتراف یا گواہی جرم کو ثابت کرے۔ چوری بھوک سے مجبور ہو کر نہ کی گئی ہو۔ اسی طرح کا معاملہ زنا کی سزا کا ہے۔ شادی شدہ زانی کے لیے رجم جب کہ غیر شادی شدہ زانی کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔ ثبوت کے لیے چار ایسے گواہ لانے ضروری ہیں جو جرم کے عینی شاہد ہوں۔ یہ سدِ باب اعلانیہ بے حیائی کو روکنے کے لیے ہے۔ اسلام کا مزاج معاشرے میں امن اور استحکام کی فضا کو قائم کرنا ہے۔ گھر کسی بھی معاشرے کی اکائی ہوتا ہے‘ اگر وہ خوش حال ہوگا تو معاشرہ بھی خوش حال ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نکاح کو آسان بنانے اور زنا کو مشکل تر کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کرتا ہے۔ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

((خَيْرُ النِّكَاحِ أَيْسَرُهُ)) (ابو داؤد: ۲۱۱۷)

’’بہترین نکاح وہی ہے جو زیادہ آسانی والا ہو۔‘‘

معاشرے میں مجرم پیدا ہونے کی سب سے بڑی وجہ گھروں کا ٹوٹنا ہے۔ شادی سے باہر تعلقات جب گھر توڑتے ہیں تو صرف دو لوگوں ہی میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اگلی نسل بھی اس کے منفی اثرات تلے پروان چڑھ کر کئی اور لوگوں کی زندگی کو مشکل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام زنا کے قریب جانے سے روکتا ہے‘ یعنی سدِ ذرائع پر زور دیتا۔ پھر اتنے جتن پر بھی کوئی نہ رکے تو

اس کے لیے عبرت ناک سزا ہے‘ تاکہ ایک کے انجام سے باقی سبق لیں۔ اس کے بعد بھی سیرت سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حتی المقدور کوشش فرماتے کہ حدود کے معاملات آپ تک نہ پہنچیں اور سزا نافذ نہ ہو‘ الاّ یہ کہ کوئی خاص بات ہو۔ (ابوداؤد: ۴۳۷۷‘ ۴۳۸۱)

اسی طرح ارتداد کی سزا موت بھی اسی لیے ہے کہ زیادہ تر یہ سیاسی بغاوت کی علامت ہے اور بدامنی کا باعث ہے۔ اس کے باوجود صحابہ کرام ؓ توبہ کا موقع دے کر اسلام کی طرف پلٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ (ابوداؤد: ۴۳۵۶)

خلاصہ

دینِ اسلام کی عبادات‘ قوانینِ شریعت اور معاملات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دین آسان ہے اور آسانیاں لانے والا ہے۔ جو لوگ اسلام کی تصدیق کرتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے راستہ مزید آسان ہوتا جاتا ہے۔ جو لوگ اسے جھٹلاتے ہیں اور برائی کی طرف مائل رہتے ہیں‘ ان کے لیے آسان راستہ (نیکی کا راستہ) مشکل اور مشکل راستہ (بدی کا راستہ) آسان کر کے دکھایا جاتا ہے۔ (سورۃ اللیل: ۵)۔ دنیا کی زندگی جتنی اور جیسی بھی ہو‘ بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ کی آسانی ہے یا ہمیشہ کی دشواری۔ جنت کا راستہ بظاہر مکروہات سے بھرا ہے اور انسان کا نفس‘ خواہشات اور شیطانی وسوسے اسے مشکل بنا دیتے ہیں لیکن دینِ اسلام کو مضبوط تھامنے والا اپنے لیے آسانیاں پیدا کر لیتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَمَّا أَهْلُ السَّعَادَةِ فَيُيَسَّرُونَ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ، وَأَمَّا أَهْلُ الشَّقَاوَةِ فَيُيَسَّرُونَ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ)) (بخاری: ۱۳۶۲)

’’بات یہ ہے کہ جن کا نام نیک بختوں میں ہے ان کو اچھے کام کرنے میں ہی آسانی معلوم ہوتی ہے اور بدبختوں کو برے کاموں میں آسانی نظر آتی ہے۔‘‘

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ذِمّہ داری ادا کرنے کی اہمیت

حافظ محمد اسد☆

انسان کی بہت سی ضرورتوں میں ایک اہم ضرورت اجتماعیت ہے۔ اس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے برکت رکھی ہے‘ جس میں نصرتِ الٰہی بھی شامل حال رہتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ)) (سنن الترمذی:۲۱۶۶)

''جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

اس لیے اجتماعیت سے الگ ہو کر زندگی گزارنا پسندیدہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں خاتمہ کو میتة الجاھلیة (جاہلیت کی سی موت) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اجتماعیت ہوگی تو لازماً اس کا ایک امیر اور سربراہ ہوگا جو اس کی قیادت کا فریضہ انجام دے گا۔ عوام اس کی راہنمائی میں اپنا سفر حیات جاری رکھتے ہوئے منزل کی طرف کامیابی کے ساتھ گامزن ہوں گے۔ قیادت و سربراہی کی اس ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ)) (ابوداؤد:۲۶۰۹)

''جب تین آدمی سفر میں ہوں تو ان میں ایک کو امیر بنا لیا کرو۔''

قوم کا سربراہ اُس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ عوام کی خیر خواہی کرنا‘ ہر طرح کی ضروریات کا خیال رکھنا اور ان کی بہتری کی فکر کرنا‘ سربراہ کی ذمہ داری ہی نہیں‘ بلکہ عین فرضِ منصبی ہے۔ اسے اس کا احساس ہونا چاہیے۔ قوم کے رہبر و رہنما کی حیثیت ایک خادم کی سی ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس فرضِ منصبی کو صحیح طریقہ سے انجام دے تو رعایا اور اس کے ماتحت افراد خوش حال ہوں گے‘ جاں نثاری کے جذبے کے ساتھ اپنا ہر طرح کا تعاون پیش کریں گے۔ اس کے برعکس سربراہ اگر خود کو قوم کا خادم تصور کرنے کے بجائے مخدوم سمجھ بیٹھے اور آرائش و آسائش کی زندگی کو مقصد بنا لے‘ ع ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے مصداق عوام کے مسائل سے آنکھیں بند

☆استاذ قرآن اکیڈمی‘ یٰسین آباد‘ کراچی

کرلے تو رعایا بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہوگی۔ بسا اوقات اس سربراہ کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرنے پر بھی آمادہ ہو جائے گی۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیائے انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ ہر طرف ظلم و ستم کا بازار گرم تھا۔ رقص و سرود میں ڈوبے عیش پسند‘ ناعاقبت اندیش رہنماؤں اور بادشاہوں کو عوام کی ذرہ برابر بھی فکر نہ تھی‘ بلکہ وہ وقتاً فوقتاً انہیں اپنے عتاب کا شکار بناتے رہتے تھے۔ پھر یہ بادل چھٹا اور آفتاب کی شکل میں ایک عظیم رہنما نمودار ہوا جس نے لوگوں کو معرفتِ خداوندی کے ساتھ قیادت و سیادت کے اصول سمجھائے۔ لوگوں کے دکھ درد بانٹ کر انہیں حقیقی زندگی جینا سکھایا اور بتایا کہ بہترین انسان ہی بہتر قائدانہ کردار پیش کر سکتا ہے۔ حقیقی قائد وہ ہے جو امانت دار‘ امن و امان کا خواہاں اور انسانوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہو‘ نہ کہ عیش و عشرت کا خواہاں۔ یہ بہتر قیادت عملی طور پر کیسے ممکن ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنی پوری زندگی سے اس سوال کا جواب فراہم کیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (متفق عليه)

''تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے‘ اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے سلسلے میں باز پرس ہوگی۔''

ذمہ داری کسی عہدے کا نام نہیں بلکہ ایک رویے کا نام ہے‘ جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے ہمیں انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر ذمہ دار مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری کے تصور کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝٣٦﴾ (بنی اسرائیل)

''بے شک کان‘ آنکھیں اور دل‘ ان سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

انسان کی شب و روز کی کامیابی‘ ترقی کی نئی نئی راہیں‘ منزل کا حصول اور زندگی میں ربط سب کچھ ذمہ داری کا مرہونِ منت ہے۔ احساسِ جواب دہی کا یہی محرک تھا جس نے صحابہ کرام ؓ کو ذمہ دار شخصیت بنا دیا‘ جو دنیا والوں کے لیے نمونہ بنے۔ دنیا نے آپ ﷺ کے تربیت یافتہ خلفائے راشدین کا دور بھی دیکھا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صِدیق ؓ امیر المومنین ہیں‘ بیت المال کے موجود ہوتے ہوئے بھی زندگی کس مپرسی میں گزری‘ مگر رعایا کے سرمایہ کو اپنے ذاتی مصرف میں نہیں لائے۔ غیر ضروری خرچ سے گریز کرتے رہے۔ پوری دُور اندیشی اور احساسِ

ذمہ داری کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیا۔ قیصر وکسریٰ کو فتح کرنے والے اور وسیع وعریض دنیا میں اسلام کا پرچم لہرا دینے والے خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کھجور کی چٹائی پر سوتے ہیں، جسم پر اس کے نشانات ابھر آتے ہیں۔ ان کی سادگی پر دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگوں کو معلوم کرنا پڑتا تھا کہ امیر المومنین کون ہیں! ان کے احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ وہ رعایا کے احوال سے نہ صرف باخبر رہتے، بلکہ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنی پیٹھ پر غلوں کا بوجھ اٹھا لیتے تھے، کیوں کہ انہوں نے اپنے قائد سرورِ عالم ﷺ کو بدستِ خود خندق کھودتے دیکھا تھا۔

تاریخ کے اوراق کو مزید پلٹ کر دیکھیں تو تابعین میں عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں عدل وانصاف کا وہ گراں قدر کارنامہ انجام دیا کہ سینگ والی بکری بھی بغیر سینگ کی بکری کو مارنے سے کتراتی تھی۔ ان کی جوانی کا دور (جب آپ خلیفہ مقرر نہیں ہوئے تھے) بڑے ہی ٹھاٹ باٹ اور شان وشوکت میں گزرا تھا۔ خوب صورت لباس پہنتے، عمدہ خوشبو لگاتے جسے دیکھ کر لوگ ٹھہر جاتے اور گلی معطّر ہو جاتی تھی۔ جب بہ حیثیت خلیفہ خود کو خادم کی حیثیت سے پیش کیا تو دنیا ایسی سادگی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

آج کا انسان اپنے اس احساسِ ذمہ داری سے عاری ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے قیادت و سیادت کا مفہوم بالکل الٹ گیا ہے۔ اب قوم کا رہبر اس کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ عوام سے خدمت وصول کرنے کے لیے اپنی عیاری اور مکاری سے کام لیتا ہے۔ ٹھاٹ باٹ کے لیے بیت المال میں جمع قوم کا سرمایہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اقتدار کی ہوس اتنی بڑھ جاتی ہے کہ لوگ اپنے ضمیر کے خزانے لٹا دیتے ہیں۔ اب یہ رعایا پر ہے کہ وہ اپنا ذمہ دار کسے چنتے ہیں، کیوں کہ یہ قیادت بھی ایک امانت ہے، جو اس کے اہل تک پہنچانا ضروری ہے۔ سورۃ النساء میں اعلان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿٥٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾

''(مسلمانو!) اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو نہایت ہی عمدہ نصیحت کرتا ہے، اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔''

پھر ذمہ داروں میں اہل شخص اپنی امانت داری اور صلاحیتوں کے ذریعے اعلیٰ اصولوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ عوام کی توقع کے مطابق اپنی خدمات انجام دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر جہاں احساسِ ذمہ داری ہے، وہیں ایمان کے تقاضے بھی ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ))(مسند احمد:۱۳۱۹۹)

''اُس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہ ہو، اور اُس شخص میں دین کا پاس و لحاظ نہیں، جس کے اندر عہد کی پاس داری نہ ہو''۔

امانت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جن کی ادائیگی تمام مسلمانوں پر لازم ہے۔ ذیل میں امانت کی چند ایسی صورتیں بیان کی جا رہی ہیں جن کی طرف عام طور پر لوگوں کا ذہن نہیں جاتا، حالانکہ شریعت کی نظر میں ان چیزوں میں بھی خیانت قبیح اور موجب گناہ عمل ہے، مثلاً:

(۱) نااہلوں کو عہدے اور مناصب سپرد کر دینا

(۲) مزدور اور ملازمین کا کام چوری کرنا

(۳) خاص مجالس کی بات کو عام کرنا

(۴) غلط مشورہ دینا:

جب کسی سے مشورہ لیا جاتا ہے تو وہ اصحابِ مشورہ کے حق میں امین ہوتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہی مشورہ دے جس میں اس کے علم کے مطابق مشورہ لینے والے کی خیر وفلاح مضمر ہو۔ دل میں جو بات آئے، کسی ذہنی تحفظ کے بغیر صاف صاف کہہ دے۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک صحابی کے مشورہ لینے پر ارشاد فرمایا:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) (سنن الترمذی:۲۸۲۳)

''جس سے مشورہ لیا جائے اس کو امین ہونا چاہیے''۔

(۵) کسی کا راز ظاہر کرنا:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ اَمَانَةٌ))(سنن الترمذی:۱۹۵۹)

''جب ایک شخص کوئی بات کہے اور چلا جائے تو یہ بھی امانت ہے۔''

(۶) حق تلفی اور ناانصافی کرنا:

موجودہ مسلم دنیا کے خراب حالات اس بات کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ اُمّت کے بڑوں میں احساسِ ذمہ داری باقی نہ رہا تھا۔ سیاسی و معاشی امور میں ذمہ دار افراد کا فقدان، علماء کا فکری رہنمائی کے میدان میں ذمہ دارانہ رویے سے انحراف، ہمارے زوال کی بڑی وجوہات ہیں۔ غیر ذمہ دارانہ رویہ غفلت، سستی اور کاہلی کو جنم دیتا ہے، جو کسی بھی قوم کے زوال میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ اگر ہم اپنا شان دار ماضی دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم میں سے ہر فرد کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہوگا۔ آج کے کام کو آج ہی کرنا ہوگا۔ خوابِ غفلت کو چھوڑ کر ذمہ دار معاشرے کے قیام کے لیے جِدّوجُہد کرنی ہوگی۔ وسائل کا درست استعمال کرنا اور معاملات کی تکمیل اپنی عادت بنانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی معاملات میں قرآن و سُنّت کا تابع بنائے۔ آمین! ❀❀❀

بقیہ: دورۂ ترجمۂ قرآن کا منظر اور پس منظر

یہ بہت بڑی مارکی ہے جس میں قریباً ڈھائی تین ہزار افراد کی گنجائش ہے۔ لاہور کے باسیوں کے لیے عموماً اور تنظیم اسلامی کے رفقاء اور کارکنان کے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے کہ وہ بڑی زوردار تحریک چلائیں اور اس مقام پر زیادہ سے زیادہ افراد کو دورۂ ترجمۂ قرآن میں شرکت کے لیے لائیں تاکہ لوگوں کو قرآن حکیم کا انقلابی پیغام پہنچ سکے اور وہ بھی تنظیم اسلامی کے قافلہ میں شامل ہو کر اسلامی انقلاب کی جِدّوجُہد کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہم سب کو دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری ان کوششوں اور کاوشوں اور قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک تنظیم کا پیغام پہنچ سکے۔

تمام رفقاء سے گزارش ہے کہ وہ بانی تنظیم اسلامی حضرت ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ کے لیے دعا فرمائیں کہ ربّ کریم ان کی قبر اطہر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائے اور ان کے درجات عالیہ کو بلند سے بلند فرمائے۔ اسی طرح امیر ثانی محترم حافظ عاکف سعید صاحب کے لیے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں جلد سے جلد صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے۔ ❀

دورۂ ترجمۂ قرآن اور فریضۂ اقامتِ دین

عبدالرؤف☆

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں آج سے کم و بیش ستر سال قبل خدماتِ قرآنی کے جس عظیم مشن کا آغاز کیا تھا، اس کے سنگ ہائے میل میں رمضان المبارک کی بابرکت راتوں میں ۱۹۸۴ء سے شروع ہونے والے دورۂ ترجمۂ قرآن کو ایک اہم حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ہر آنے والے سال میں تنظیم اسلامی کی سطح پر اس میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں عوام الناس کی بہت بڑی تعداد اس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ قرآن کے ذریعے عوام میں پیدا ہونے والی تبدیلی کا باعث اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحبؒ جیسی عظیم عبقری شخصیت کو بنایا ہے، لہٰذا اسی وجہ سے اس کا بہت بڑا کریڈٹ ڈاکٹر صاحبؒ کی ذات کو جاتا ہے۔ مزید برآں، ان کے لیے یہ بہت بڑا صدقۂ جاریہ اور توشۂ آخرت بھی بن رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دروس میں نظمِ قرآن کی خوب صورت جھلک، فلسفہ و حکمتِ قرآن کے مضامین کی آسان انداز میں ادائیگی اور اسلافِ اُمّت سے تعلق کی خوشبو نمایاں تھی۔ ہر طبقۂ فکر کے سامعین مشامِ جاں کو معطر کر کے اُٹھتے تھے اور ہر کوئی اپنے ظرفِ ذہنی کے مطابق اس سے استفادہ کرتا تھا۔ البتہ ان کے دروس کا سب سے نمایاں پہلو دین کے ہمہ گیر تصور کا بیان تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شعلہ بیانی اور مولانا مودودیؒ کی سلاستِ تحریر کا امتزاج تھے۔ اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کی اس بلندی پر تھے جہاں وقت کے بڑے بڑے صحافی، دانشور، مقرر، مصنف اور عالمِ دین بھی نہ پہنچ سکے۔ بقولِ شاعر: ع ''یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا!''

اس کی وجہ بھی تھوڑے سے غور و فکر سے بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ انہوں نے قرآنِ حکیم کو

☆معاون شعبہ تعلیم و تربیت، تنظیم اسلامی

سیرت النبی ﷺ کے انقلابی پہلو کی روشنی میں سمجھا تھا‘ نہ کہ ایک محدود مذہبی تصور کے زیرِ سایہ۔ نبی اکرم ﷺ نے وحی الٰہی کی رہنمائی میں اکیلے سفر کیا اور معاشرے کے ایک بہت بڑے طبقے کی شدید ترین مخالفت کے باوجود اپنے تخیل اور مقصد کو بلند رکھا۔ مکہ جیسے چھوٹے سے شہر میں رہ کر اپنے مخاطبین کو یہ پیغام دیا کہ:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا، وَتَمْلِكُوا بِهَا الْعَرَبَ، وَتُدِينُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ، فَإِذَا مِتُّمْ كُنْتُمْ مُلُوكًا فِي الْجَنَّةِ))

’’لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو‘ کامیاب رہو گے۔ اس کی بدولت تم عرب کے بادشاہ بن جاؤ گے‘ اور اس کی وجہ سے عجم بھی تمہارے زیرنگیں آ جائیں گے۔ پھر جب تم وفات پا جاؤ گے تو جنت کے اندر بادشاہ ہو گے۔‘‘

سیرت النبی ﷺ کا یہی ایک اہم ترین نقطہ تھا جس کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی جِدّوجُہد کا آغاز کیا اور ۱۹۶۷ء میں اکیلے ہی ایک بہت بڑے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ چند سال بعد معدودے چند سرپھرے فرزانوں کا جو قافلہ سخت جاں تیار کیا‘ اس کا مقصد کسی ایک ادارے‘ انسٹیٹیوٹ‘ اسکول‘ کالج‘ مسجد‘ مدرسہ یا جامعہ تک محدود نہیں رکھا‘ بلکہ واضح کر دیا کہ اس کے پیشِ نظر سب سے پہلے پاکستان میں نظامِ خلافت کا قیام اور بعد ازاں پوری دنیا میں خدائے لم یزل کے عطا کردہ دینِ عدلِ اجتماعی کا غلبہ ہے۔ اس کے بعد پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور زندگی کے آخری لمحات تک ؎

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی‘ کبھی پیچ و تابِ رازی

کے مصداق اپنی زندگی کی موم بتی کو دونوں طرف سے جلاتے رہے۔ اپنے ہر درس‘ تقریر‘ خطاب اور دورۂ ترجمۂ قرآن کے اختتام پر مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد کراتے کہ آج کا دور نوافل کا نہیں بلکہ فرائض کا ہے‘ اور فرائض میں اہم ترین فریضہ اقامتِ دین کی جِدّوجُہد ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ ہر سال دورۂ ترجمۂ قرآن کے آخر میں خصوصی خطاب فرماتے تھے‘ جس میں شرکاء کے سامنے قرآن کا اصل پیغام واضح انداز میں پیش کرنے کے بعد ان کو اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کی دعوت دیتے۔ ان کا اسی طرح کا ایک خطاب

ماہنامہ ’’میثاق‘‘ ماہ مئی ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا‘ جس کا عنوان تھا: ’’قرآنِ حکیم کا پیغام: مدنی سورتوں کے مضامین کی روشنی میں‘‘۔ اپنے اس تفصیلی خطاب میں ڈاکٹر صاحبؒ ’’قرآنِ حکیم کا حاصلِ مطالعہ‘‘ کے عنوان سے فرماتے ہیں:

’’اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کے ان مباحث کا حاصل کیا ہے۔ میں اپنے مطالعۂ قرآن‘ فہمِ قرآن اور تدبرِ قرآن کا خلاصہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کی فرضیت

اگر دینِ حق مغلوب ہو اور باطل اور طاغوت غالب ہو تو مسلمان کا اوّلین فرضِ عین اس طاغوت کو ختم کر کے اس کے غلبے کو توڑ کر اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جِدّوجُہد کرنا ہے۔ یہ اصل اور پہلا فرضِ عین ہے جو نماز پر بھی مقدم ہے۔ اس لیے کہ نماز کی صداقت کا معیار یہی ہے۔ اگر آپ یہ کر رہے ہیں تو آپ کی نماز صحیح ہے‘ اور اگر یہ نہیں کر رہے (اور باطل نظام کو دل سے تسلیم کیے بیٹھے ہیں) تو آپ کی نماز جھوٹی ہے۔ آپ نے باطل کا غلبہ گوارا کر رکھا ہے اور نماز میں ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ کہہ رہے ہیں تو آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہاں‘ آپ نے باطل کو تسلیم نہیں کیا‘ باطل کے خلاف آپ کی جِدّوجُہد جاری ہے‘ اور آپ کہیں کہ ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ تو آپ سچ بول رہے ہیں۔ آپ نماز میں کہہ رہے ہیں ’’وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ‘‘ یعنی ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور ہم ان سے قطع تعلق کرتے ہیں جو تیرے فاسق اور فاجر ہوں‘ لیکن ہماری وہی دوستیاں اور وہی رشتہ داریاں برقرار ہوں تو ہم اللہ کی جناب میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ چنانچہ پہلا فرضِ عین اللہ کے دین کی اقامت اور اس کے غلبے کی جِدّوجُہد ہے۔ یہ ایسا فرض ہے جس کے ادا ہونے پر ہر فرض کی صحت کا دارومدار ہے۔ نماز بھی اس کی استعانت کے لیے ہے۔ حکم دیا گیا: ﴿وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ﴾ (البقرۃ:۴۵) یعنی اس مقصد کے لیے نماز اور صبر سے استعانت (مدد) حاصل کرو۔

ہاں‘ اگر ہم خلافتِ راشدہ کے دور میں پیدا ہو چکے ہوتے تو اس کے برعکس صورتِ حال ہوتی۔ اسلام کا نظام اگر قائم ہو تو اس نظام کی مزید توسیع اور اسے عالمگیر پیمانے پر پھیلانا حکومت کی ذمہ داری ہے‘ اور ہم حکومت کے نظم کے پابند ہیں۔ اس صورت میں یہ جِدّوجُہد فرضِ کفایہ ہے۔ حکومت کو جتنے رضاکار مطلوب ہیں وہ اگر مہیا ہو جائیں تو باقی سب لوگ اپنے گھروں میں پاؤں پھیلا کر سوئیں‘ ان پر کوئی ملامت نہیں۔

اس صورت میں یہ فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے‘ جیسے نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے۔ کچھ لوگوں نے نماز پڑھ لی تو باقی سب کی طرف سے بھی ادا ہو جائے گی‘ اگر کسی نے بھی نہ پڑھی تو سب گناہ گار ہوں گے۔ اس معنی میں اگر خلافت کا نظام قائم ہو‘ دین غالب ہو تو افراد کے اوپر سے غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے‘ کیونکہ حکومت اسلامی کا ادارہ موجود ہے۔ وہ ان معاملات کی دیکھ بھال کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو عالمی سطح پر قائم کرنے کے لیے کیا اقدامات کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے جو افرادی اور مالی قوت چاہیے وہ لوگ پیش کر دیں تو بس ٹھیک ہے۔ لیکن جب صورت یہ نہیں ہے اور آپ باطل کے غلبے میں جی رہے ہیں تو اقامتِ دین کی جِدّوجُہد آپ کا اولین فرضِ عین ہے۔ اسے اضافی نیکی نہ سمجھیے۔ یہ فرضِ عین ہے‘ اسے فرضِ کفایہ نہ سمجھیے۔ فرضِ عین کے تصور میں دو چیزوں کی نفی ہے: یعنی یہ اضافی نیکی نہیں ہے اور فرضِ کفایہ نہیں ہے۔‘‘

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ حکیم سے تعلق قائم کرنے کے بہت سے مادی اور روحانی فیوض و برکات ہیں‘ اور ہر انسان اپنی افتادِ طبع کے مطابق ان سے شاد کام بھی ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ جب تک زمین آسمان قائم ہیں‘ چلتا رہے گا۔ البتہ دورِ مغلوبیت میں قرآن سے استفادے کے لیے موجودہ ظالمانہ اور طاغوتی نظام کی آلائشوں کا شعور حاصل کرنا اور قرآن کی روشنی میں اس گھمبیرتا سے نکلنے کے لیے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ اگر اسے ۱۴۰۰ سال پرانی کتاب سمجھ کر ہی پڑھا جائے گا‘ تو پھر اس میں موجود مومنین‘ کفار‘ منافقین اور یہود و نصاریٰ سے خطاب کو بھی محض اسی دور سے متعلق سمجھ کر پڑھا تو ضرور جائے گا‘ لیکن فرمانِ نبوی ﷺ: ((فِيهِ نَبَأُ مَا كَانَ قَبْلَكُمْ، وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ)) یعنی ’’اس میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں بھی ہیں‘ تمہارے بعد آنے والوں کے لیے احوال بھی ہیں‘ اور تمہارے باہمی مسائل و اختلافات کا حل بھی ہے‘‘ کا شعور حاصل نہیں ہو سکے گا۔

بانیٔ تنظیم‘ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی یہی خصوصیت تھی جو ان کو دوسرے علماء اور مدرّسینِ قرآن سے ممتاز کرتی تھی کہ وہ قرآن کے ساتھ اس انداز کا تعلق قائم کرتے کہ ہر سننے والا یہ محسوس کرتا کہ یہ کتاب تو میرے لیے نازل ہوئی ہے۔ ۱۴۰۰ سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہمارے لیے اس میں رہنمائی کا مکمل سامان موجود ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب یہ الفاظ بھی استعمال کیا

کرتے تھے: *I want to learn the Quran of today.*

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ایک صدی قبل اُمت کی زبوں حالی کی وجہ قرآن سے دوری بیان کی تھی‘ اور اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کروں کہ قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کروایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔ ان کے راہیٔ ملکِ عدم ہونے کی بنا پر اس کام کا ڈول نہ ڈالا جا سکا۔ بعد ازاں اُن کے شاگردوں میں سے ایک بہت بڑی علمی شخصیت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے اپنے شہر کی سطح پر اس کام کو آگے بڑھایا اور شہر لاہور میں ۴۰ سال تک درسِ قرآن دیا۔ ان کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو یہ توفیق بخشی کہ وہ عوامی سطح پر درسِ قرآن کو لے کر آگے بڑھے اور پاکستان بھر میں قرآن کے پیغام کو عام کیا‘ جو آج بھی ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا بھر کے اردو بولنے والوں تک پہنچ رہا ہے۔ اس طرح درسِ قرآن جو پہلے مدارس کے علماء و طلبہ تک محدود تھا‘ اُس نے عوامی درسِ قرآن کی شکل اختیار کی‘ جس کے نتیجے میں عوام الناس خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ قرآن کی آفاقی تعلیمات سے بہرہ وَر ہوا۔

یہ سلسلہ پھر رکا نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحبؒ کی صُلبی و معنوی اولاد نے اسے مزید آگے بڑھایا‘ اور ملک کے طول و عرض تک دعوتِ قرآنی پھیلتی چلی گئی۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ علماء کے طبقے نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں درسِ قرآن اور قرآنی تعلیمات پر مبنی کورسز کا آغاز کیا‘ جو انتہائی خوش آئند بات ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی مدح میں مختلف رسائل و جرائد میں جو مضامین ان کی خدماتِ جلیلہ خصوصاً خدمتِ قرآن کے حوالے سے تحریر کیے گئے‘ انہی میں کراچی کے ایک معروف عالمِ دین مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کا مضمون تھا‘ جس کو انہوں نے ’’ہمارے ڈاکٹر صاحب‘‘ کا عنوان دیا۔ اس مضمون میں یہ شاہکار جملہ تحریر کیا گیا کہ: ’’ایک ڈاکٹر (ڈاکٹر اسرارؒ) نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔‘‘ اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہ کام تو علماء کرام کا تھا کہ درسِ قرآن کے ذریعے عوام الناس کو قرآن سے جوڑتے‘ اس کے ذریعے ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا کرتے اور معاشرے میں

تبدیلی کا کام کرتے‘ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو مدارس کی چار دیواری تک محدود کرلیا۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی برپا کی ہوئی تحریکِ رجوع الی القرآن ہی کے ثمرات ہیں کہ دروسِ قرآن‘ فہمِ دین کورسز‘ رجوع الی القرآن کورسز اور دیگر سرگرمیوں کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر عوام الناس تک قرآنِ حکیم کا پیغام پہنچ رہا ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا اضافہ رمضان کی مبارک راتوں میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز ہے۔ اسی دورۂ ترجمۂ قرآن نے بعد میں ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی‘ اور بلا مبالغہ ہر سال سینکڑوں مقامات پر اس کا نہ صرف باقاعدگی سے انعقاد بلکہ مسلسل اضافہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن کا اصل مقصد یہ تھا کہ عوام الناس میں قرآن کے ذریعے پہلے شعوری ایمان کے حصول کی تحریک برپا ہو۔ پھر اگلے مرحلے میں قرآن سے جڑنے والوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اس ظالمانہ طاغوتی نظام کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو اور اس کی بنیادوں کو گرا کر اسلام کے عادلانہ نظام کا قیام عمل میں لانے کے لیے اپنا تن‘ من‘ دھن وقف کر دے۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی نوعیت کا کام نہیں۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں ﴿اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمان) ’’بے شک یہ بڑے حوصلے اور عزم کے کاموں میں سے ہے‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس اہم ترین فریضہ کی ادائیگی کے لیے اخلاص کی دولت کے ساتھ ساتھ جرأت‘ ہمت اور حوصلہ سے مزاحم قوتوں کے ساتھ ٹکرانے کا جذبہ درکار ہے‘ جس کے لیے علامہ اقبال نے ’’بالِ جبریل‘‘ میں یہ اشعار کہے ہیں: ؎

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے‘ شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے‘ طاؤس فقط رنگ

قرآن حکیم کو جب تک سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک ہماری انفرادی اور اجتماعی حیات میں وہ حقیقی انقلاب نہیں برپا ہوسکتا جس کے زیر اثر اس دنیا میں بھی

حقیقی تبدیلی پیدا ہو اور آخرت کی تیاری بھی احسن انداز میں ہوسکے۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کی اس عظیم الشان تحریک کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کے علاوہ بھی کچھ افراد اور ادارے اپنی اپنی سطح پر یہ خدمت انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے نزدیک اس اعتبار سے خوش آئند ہے کہ قرآن حکیم کا لازوال پیغام مزید پھیلے گا جس کے نتیجہ میں عوام کی بہت بڑی تعداد اس سے مستفید ہوسکے گی۔ البتہ اس سے صحیح استفادہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے ایک زندہ کتاب کی حیثیت سے حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں اور موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ اس صورت میں قرآن حکیم کے ذریعہ عوام الناس میں ایمانی حرارت پیدا ہوگی۔ قرآن حکیم کو سیرت کی روشنی میں سمجھنے کے انسان پر کیا اثرات مترتّب ہوتے ہیں‘ اسے مولانا مودودیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تفسیر ’’تفہیم القرآن‘‘ کے مقدمہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

’’لیکن فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے‘ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لاکھڑا کیا‘ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی‘ اور وقت کے عَلَم بَردارانِ کفر و فسق وضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی‘ اور حق و باطل کی اس طویل اور جاں گُسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔

اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و

جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں‘ اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو‘ اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں‘ اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے‘ اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا‘ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے‘ اور سابقین اولین سے لے کر مؤلَّفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔

یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو مَیں سلوکِ قرآنی کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے‘ قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اُس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معنی و بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں‘ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔ پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام‘ اس کی اخلاقی تعلیمات‘ اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات‘ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو‘ اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔‘‘

جس طرح مولانا مودودیؒ کے مذکورہ بالا الفاظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں‘ بالکل اسی طرح مصر کے معروف انقلابی رہنما اور مفسرِ قرآن سید قطب شہیدؒ نے بھی اپنی تفسیر ’’فی ظلال القرآن‘‘ میں اس موضوع پر جو الفاظ کے موتی بکھیرے ہیں وہ پڑھنے والوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

’’قرآن کی اپنی ایک فضا ہے جس میں اس کے قاری‘ اس کے مطالعہ کرنے والے‘ اس کے مضامین پر غور کرنے والے اور اس کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلنے والے زندہ رہتے ہیں۔ یہ فضا محض اس کا درس و تدریس اور قراءت و مطالعہ نہیں ہے۔ قرآنی فضا میں زندہ رہنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان اس قسم کے احوال اور ظروف میں زندگی گزارے جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔ وہی تحریک ہو‘ وہی جِدّوجُہد ہو‘ مخالفت کے طوفانوں سے وہی مقابلہ ہو‘ معاندین کے ساتھ وہی کشتی ہو‘ وہی انتظام و اہتمام ہو جو اُمّتِ مُسلمہ کی پہلی صف کے وقت میں تھا۔ یہ جاہلیت جو آج روئے زمین پر محیط ہے‘ اس کے ساتھ وہی مقابلہ ہو جو پہلی جماعتِ مسلمہ نے کیا تھا۔ قرآنی فضا میں زندگی گزارنے والے کے دل و جان اور حرکت و سکون میں یہی ولولہ ہو کہ اسے اپنے نفس میں اور تمام انسانوں کے قلب و روح میں اسلام کی روح کو پھونکنا ہے۔ جس طرح پہلی بار جاہلیت سے مقابلہ ہوا تھا‘ اب ایک بار پھر وہی مقابلہ کرنا ہے۔ جاہلیت کے ہر تصور‘ ہر عقیدے‘ ہر رسم و رواج اور ہر تنظیم کو مٹا کر اس کی جگہ پر زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی شعبے میں اسلام کو نافذ کرنا ہے۔ قرآن کا ذوق حاصل کرنے کے لیے اس فضا میں زندہ رہنا اور اس فضا کو برپا کرنا ضروری ہے۔ قرآن کا نزول اس فضا میں ہوا تھا اور اس کا عمل دخل انہی حالات میں قائم ہوا تھا۔ جو لوگ اس قرآنی فضا میں زندگی نہیں گزارتے‘ وہ قرآن کی درس و تدریس اور قراءت اور علوم کے خواہ کتنے ہی ماہر ہوں‘ وہ ہر وقت اسی میں غرق رہیں مگر وہ قرآن سے الگ تھلگ ہیں۔‘‘

اس تحریر کے ذریعہ تنظیم اسلامی کے مدرّسین پر بھی ہم یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے مقاصد ان پر واضح رہنے چاہئیں۔ جو ہدایات انہیں دی جاتی ہیں اُن میں جہاں دیگر بہت سی احتیاطوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہیں یہ خصوصی تاکید بھی کی جاتی ہے کہ تذکیری اور عملی پہلو یعنی ایمان و یقین کی پختگی اور دینی فرائض کی ادائیگی پر توجہ زیادہ مذکور رہے۔ دین کا ہمہ گیر تصوّر‘ فرائض دینی کے جامع تصور اور انقلابی فکر پیش کرنے کے لیے بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے خطابات اور تحریروں کو گفتگو کی بنیاد بنائیں۔ مدرسین اگر ان ہدایات کو سامنے رکھیں گے تو اُمید ہے کہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے مقاصد کے ساتھ اُن کی ہم آہنگی برقرار رہ سکے گی۔ اس کے ذریعہ سامعین اپنے اندر ایک حقیقی تبدیلی محسوس کریں گے۔ یہی تبدیلی دورۂ ترجمۂ قرآن کا اصل حاصل ہے!

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے تجویز کردہ

عوامی درسِ قرآن کی عملی تعبیر

دورۂ ترجمۂ قرآن

کا منظر اور پس منظر

مولانا شیخ رحیم الدین

بانی تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو پوری دُنیا میں اُمّتِ مُسلمہ قعرِ مذلت میں گری ہوئی تھی اور چار سُو اس پر ذلت و نکبت چھائی ہوئی تھی۔ اُس وقت برعظیم پاک و ہند میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال اور مولانا الطاف حسین حالی کا طوطی بول رہا تھا اور وہ مسلمانانِ عالم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اے مسلمانو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم نے کبھی غور کیا کہ اس ذلت و رسوائی کا سبب کیا ہے؟ کیا ہم وہی قوم نہ تھے جو ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کو فروغ دیتے تھے' اخلاقِ عالیہ کی بے مثال و بے نظیر روایات ہم قائم کرتے تھے' جواں مردی و جاں فشانی کے چشمے ہم سے پھوٹتے تھے' جہاں بانی و حکمرانی کے طور طریقے دنیا کو ہم سکھاتے تھے' اختراعات و ایجادات کا ایک سیلِ مسلسل ہمارے ہاتھوں رواں تھا۔ اِن عظیم الشان روایات کے امین ہونے کے باوجود آج ہماری یہ حالت زار کیوں ہے؟ بقول غالب ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

علامہ مرحوم اس ساری صورتِ حال کا تجزیہ اور اس کا حل اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

علامہ مرحوم کا یہ شعر نوخیز ''اسرار احمد'' کے ذہن میں شعوری طور پر پیوست ہو گیا اور آپ نے اوائل عمر ہی میں یہ عزم کیا کہ میں قرآن حکیم کی تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کروں گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس وقت کے مخصوص ظروف و احوال کی بنا پر آپ نے نہ کسی مدرسہ کا رخ کیا نہ کسی دار العلوم میں داخلہ لیا' بلکہ سکول اور کالج میں تعلیم پائی' اور کالج کی سطح پر بھی ادب' فلسفہ یا عمرانیات و اسلامیات کے طالب علم نہ رہے بلکہ سائنس اور طب کی تعلیم میں مصروف رہے۔ عربی زبان سے آپ کو بچپن ہی سے شغف تھا۔ چنانچہ سکول کی تعلیم کے دوران آپ نے عربی بطور اختیاری مضمون پڑھی۔ بعد ازاں آپ کی علمی استعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ارادوں اور عزائم کو pursue کرنے کی غرض سے آپؒ نے قرآن حکیم اور مختلف تفاسیر کا مطالعہ شروع کیا' جس سے ذہن کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور آپؒ کے دروس کے چرچے ہونے لگے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ منتخب ہونے کے بعد تو پورے ملک میں آپؒ کے دروس ہونے لگے۔

آپؒ کے دروسِ قرآنی میں علامہ اقبال کا سوزِ دروں' فراہیؒ و اصلاحیؒ کا تدبر و تعمق' ابو الاعلیٰؒ و ابو الکلامؒ کا غلبہ و اقامتِ دین کا حرکی تصور موجزن نظر آنے لگا۔ نیز ادبیت کی چاشنی سے معمور یہ دروس شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے رسوخ فی العلم کا پرتو بننے لگے۔ اس پر مستزاد آپ کے منطقی و استدلالی اندازِ درس و خطاب' الفاظ کی ادائیگی کے زیر و بم' چشم و ابرو کے اشارے اور موقع محل کی مناسبت سے فارسی و اردو کے موزوں اشعار کے استعمال سے آپؒ کے درسِ قرآن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اتنا قبولِ عام بخشا کہ وہ ''عوامی درسِ قرآن'' کے اُس خواب کی عملی تعبیر بن گیا جو کہ لگ بھگ ۷۰'۸۰ سال قبل حضرت شیخ الہندؒ نے دیکھا تھا۔ چنانچہ آپؒ کے دروس و خطابات میں سامعین و ناظرین پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی تھی۔ کئی کئی ہزار لوگ ڈھائی ڈھائی گھنٹہ کے درسِ قرآن میں شریک ہوتے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق حصہ وصول کرتا تھا۔

۱۹۷۲ء میں محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے انتہائی عاجزی اور انکساری سے اپنے ربّ کے حضور یہ التجا پیش کی کہ ’’اے میرے ربّ! اب میری زندگی کے روز و شب صرف تیری آخری کتاب قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خالص اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جِدّ و جُہد کے لیے وقف ہوں گے۔‘‘ یہ عہد و پیمان کرتے ہوئے موصوف کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ مجھے ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ﴾ کی کڑی شرائط کو امکانی حد تک پورا کرنا ہوگا‘ اور اگر مَیں نے ربّ کریم کی تائید و توفیق سے یہ پوری کرلیں تو پھر لازماً ﴿فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا ⑲﴾ (الاسراء) کے مژدہ جانفزا کا پروانہ بھی ربّ کریم کی جانب سے جاری ہو جائے گا۔

پھر ایسا ہی ہوا کہ موصوفؒ نے اپنے عہد و پیمان کے مطابق اپنے جسم و جاں کی توانائیاں اس راہ میں لگا دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آپؒ کے دروسِ قرآن کا چرچا پورے ملک کے طول و عرض میں گونجنے لگا۔ جس طرح خوشبو اور انقلاب کو کسی ایک جگہ مقید نہیں کیا جا سکتا اسی طرح توحید و رسالت اور قرآن و سُنّت کی تعلیمات کی روشنی اور انقلابی فکر کو کسی ایک خطہ زمین یا جغرافیائی حدود میں پابندِ سلاسل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سب کچھ محترم ڈاکٹر صاحب کے خطباتِ قرآنی اور قرآن کے انقلابی فکر کے ساتھ ہوا۔ یہ دعوتِ قرآنی‘ آج پوری دنیا میں جہاں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والے حضرات موجود ہیں (جو کُل مسلم آبادی کا قریباً ایک تہائی بنتے ہیں) وہاں پہنچ چکی ہے۔

خوش قسمتی سے اکتوبر ۱۹۸۹ء میں مجھے حضرت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پندرہ دن ہندوستان کے مختلف شہروں میں گزارنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اُس وقت مجھے شدّت سے احساس ہوا کہ یہاں لوگ ڈاکٹر صاحب سے کس قدر متعارف ہیں‘ کیونکہ لوگ جوق در جوق اپنے اہل و عیال کے ساتھ پروگراموں میں شرکت کے لیے آتے۔ اسی دوران حیدر آباد دکن میں کُل ہند مجلس تعمیرِ ملّت کے زیرِ اہتمام ’’یوم رحمۃ للعالمین ﷺ‘‘ کے عنوان سے بارہ ربیع الاوّل کو ایک جلسہ عام کا اہتمام تھا۔ اس جلسہ کے واحد مہمان اور مرکزی مقرر امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسّس مرکزی انجمن خدام القرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔ اس جلسہ میں ایک محتاط

اندازے کے مطابق کم از کم ڈیڑھ لاکھ افراد موجود تھے‘ جنہوں نے آپ کا پورا خطاب اس قدر انہماک اور توجہ سے سنا جیسے مسحور ہو گئے ہوں۔ اسی طرح آپ کے جتنے پروگرام بھی ہوئے وہاں پر حاضری انتظامیہ کے اندازوں سے کئی گنا بڑھ کر رہتی تھی۔ ہر سامع اجتماع کے بعد آپ سے مزید تعارف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہاں پر ایسے لوگوں سے بڑی تعداد میں ملاقات رہی جو آپ کے دروس کے کیسٹس سن سن کر اَز بر یاد کر چکے تھے۔

اگست ۲۰۰۴ء میں انڈیا کے دارالحکومت دہلی میں ایک عظیم الشان بک فیئر کا اہتمام کیا گیا تھا‘ جس میں پوری دنیا سے پبلشرز حصہ لے رہے تھے۔ انجمن خدّام القرآن لاہور کو بھی اس بک فیئر میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی تھی‘ چنانچہ مجھے ایک دفعہ پھر پندرہ سال بعد دہلی جانے کا موقع میسر آیا۔ اس دفعہ یہاں جو ماحول دیکھا وہ حیران کن تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یہاں کے ہر مسلم گھرانے میں موجود ہیں اور لوگ آپ کے دروس و خطاباتِ قرآنیہ کو دن میں کئی کئی مرتبہ سنتے ہیں۔ پھر یہ کہ سننے والوں میں ہر مسلک و مشرب اور دین و مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ ان کی عقیدت و محبت کا حال یہ تھا کہ جب وہ ہمارے سٹال پر آتے تھے تو جانے کا خیال دل سے نکال چکے ہوتے تھے۔ صبح سے رات گئے تک لوگ مجھ سے موصوف کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے۔

دہلی کے ایک معزّز گھرانے کے ایک نوجوان کی دعوتِ ولیمہ کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کا دو سی ڈیز پر مشتمل ایک خطاب پانچ ہزار کی تعداد میں بلاتفریق مذہب و ملّت مہمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس طرح یہ دعوتِ قرآنی دہلی کی ایلیٹ کلاس میں پھیل رہی ہے‘ جس میں سیاسی زعماء‘ تاجر برادری نیز پنڈت اور پادری حضرات بھی شامل ہیں اور جبہ و دستار کے حاملین بھی۔ یہ سلسلہ اس طرح چل نکلا ہے کہ مختلف مواقع پر ڈاکٹر صاحب کے مختلف خطابات کی سی ڈیز تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔

بک فیئر میں ہمارے سٹال سے چند گز کے فاصلہ پر ایک غیر مسلم جو اعلیٰ تعلیم یافتہ‘ چہرے بشرے سے شریف النّفس نیز وضع قطع سے متموّل معلوم ہوتے تھے‘ گزر رہے تھے۔ اُس وقت ’’تعارفِ قرآن‘‘ کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی ڈی وی ڈی چل رہی تھی۔ جونہی ان کی نظریں ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر پڑیں اور ڈاکٹر صاحب کی آواز ان کے کان

میں پڑی‘ وہ وہیں صامت و ساکت ہو کر کھڑے ہو گئے اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ پھر ایک ایک قدم ہمارے سٹال کی طرف بڑھنے لگے اور مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ میں نے ڈاکٹر صاحبؒ کا تعارف کروایا تو وہ فرمانے لگے ’’ان کے گلے میں تو بھگوان بول رہا ہے‘‘۔ اس فقرہ سے ان صاحب کا ذوق اور اشتیاق ظاہر ہو رہا تھا۔ قرآن حکیم حق تعالیٰ شانہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے‘ تو واقعی ان صاحب کو خدا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کرسی پیش کی تو وہ بیٹھ گئے‘ وہ ڈی وی ڈی مکمل ہونے پر دوسری لگانے کی فرمائش کی اور وہ بھی سن لی۔ اس دوران ان کے اہل خانہ بار بار آ کر مطالبہ کرتے رہے کہ ہم فارغ ہو گئے ہیں‘ گھر چلیں‘ مگر وہ ان کو ٹالتے رہے اور کہتے رہے کہ کچھ اور خریداری کر لیں۔ بالآخر ان کا ڈرائیور آیا اور کہنے لگا صاحب جی بہت دیر سے گاڑی میں سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں‘ تب وہ بادلِ نخواستہ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ میں نے ۱۰۸ ڈی وی ڈی پر مشتمل ’بیان القرآن‘ کا سیٹ ہدیۃً پیش کیا کہ یہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے تحفہ ہے۔ اس پر موصوف نے فرمایا: ’’یہ میں ضرور لوں گا مگر پہلے اس کا کیش میمو بنا دیں‘‘۔ اور جاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے ’’میں اس کا ایک ایک لفظ سنوں گا‘ یہ تو بھگوان کا کلام ہے۔‘‘

دہلی کے ایک گرامر سکول کی پرنسپل صاحبہ سٹال پر تشریف لائیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے خطبات و دروس سے بے حد متاثر تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے اسکول کی انتظامیہ کو بڑی جرح وقدح کے بعد اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ اسکول کی اسمبلی میں روزانہ نصف گھنٹہ ڈاکٹر صاحب کا ترجمۂ قرآن سنایا جائے اور ہم اس کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔ انہوں نے ۱۰۸ سی ڈیز کے دو سیٹ خریدے اور دوسرے دن میرے موبائل پر یہ خوشخبری سنائی کہ آج ہم نے اسمبلی میں نصف گھنٹہ درسِ قرآن سنایا ہے‘ تمام اساتذہ وطلبہ نے بے حد دلچسپی و دلجمعی سے سنا ہے اور سب نے از خود اس سلسلے کو جاری رکھنے کی فرمائش کی ہے۔

یہ ان سینکڑوں مشاہدات میں سے چند ایک تھے جو قلم بند کیے گئے ہیں‘ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

بک فیئر سے واپسی پر میں نے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی خدمتِ عالیہ میں اپنے مشاہدات وتاثرات پیش کیے تو موصوف کی خوشی و انبساط دیدنی تھی۔ اپنی کاوشوں کے نتائج سن کر فرطِ جذبات سے آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ موصوف کے یہ آنسو بارگاہِ خداوندی میں خود خداوندِ عالَم سے گویا یوں ہم کلام ہوتے ہیں:

’’اے میرے مولا! تُو نے مجھے جو صلاحیتیں عطا کی تھیں اور جس قوتِ بیانیہ سے مالا مال کیا تھا مَیں نے اسے امکانی حد تک تیرے کلام کو تیری مخلوق تک پہنچانے میں لگا دیا ہے۔ اور یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس کے ثمرات بھی تیرے فضل و کرم سے مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں!‘‘

---

۳ مئی ۱۹۸۴ء کو محترم ڈاکٹر صاحب نے اُس وقت کے قیم تنظیم اسلامی محترم قمر سعید قریشی اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن کے سامنے یہ بات رکھی کہ ’’جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں نمازِ تراویح کے موقع پر تلاوت کردہ حصہ کے اہم مضامین پر کئی دفعہ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ میرے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ اس سال تراویح میں چار رکعت میں پڑھی جانے والی آیات کا رواں ترجمہ اہم نکات کی امکانی حد تک مختصر تشریح‘ ربطِ آیات اور نظمِ سورۃ کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اس طرح ۲۹ ویں شب میں ترجمہ قرآن مکمل ہو جائے گا۔‘‘ اس تجویز کو محترم قمر سعید قریشی نے بے حد پسند فرمایا اور عرض کیا: ’’ڈاکٹر صاحب! اہم ترین بات یہ ہے کہ اس طور پر قرآن حکیم کا ترجمہ اور اہم تشریحات ریکارڈ ہو جائیں گی جن سے مستقبل میں دعوت رجوع الی القرآن کے کام کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد ملے گی۔‘‘ قمر سعید قریشی صاحب کے یہ الفاظ آج قریباً ۴۲ سال بعد حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

محترم قمر سعید قریشیؒ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے ساتھ شروع سے شریک کار رہے ہیں۔ آپ انجمن اور تنظیم کے اہم مناصب پر فائز رہے۔ آپ جس منصب پر بھی رہے اس کا حق ادا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی طرف سے جو بھی مہم آپ کے حوالے کی جاتی اس کو احسن طریقے پر ادا کرنے کے لیے جسم وجاں کی ساری توانائیاں لگا دیتے۔ قدرت بھی آپ پر بڑی مہربان رہتی تھی جس کی وجہ سے آپ ہر مہم میں کامیاب رہے۔ مورخہ ۱۱/جولائی ۲۰۲۵ء کو طویل علالت

کے بعد محترم قمر سعید قریشی بھی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور سیئات سے درگزر فرمائے۔ آمین!

۱۹۸۴ء میں رمضان المبارک جون کے گرم ترین ایام میں آیا تھا۔ ان سخت اور نامساعد حالات میں جبکہ مسجد میں اے سی کی سہولت بھی نہیں تھی' ڈاکٹر صاحبؒ نے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد کے آسرے پر دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز فرمایا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ ۸ رکعت کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کو پسینہ کی شدت کی وجہ سے کپڑے تبدیل کرنے پڑ جاتے تھے' لیکن وہ مردِ درویش اس سب کے باوجود اپنی دھن میں آگے بڑھتا گیا۔ جوں جوں اس کا جنون بڑھتا گیا اسی طرح لوگوں کا رجوع بھی بڑھتا گیا اور سامعین کی حاضری تمام اندازوں اور تخمینوں سے آگے نکل گئی۔ عشاء اور تراویح رات نو بجے سے شروع ہو کر نمازِ وتر صبح سحری کے وقت ادا ہوتی۔ قرآن کے ان شیداؤں کو بعض دفعہ اپنے گھر جا کر سحری کھانے کا بھی موقع مشکل سے ملتا۔ گویا رات بھر یہ ''مشروع محفل سماع'' جاری رہتی اور چاند ستارے میر محفل کو رشک بھری آنکھوں سے دیکھتے۔

۱۹۸۴ء میں یہ دورۂ ترجمۂ قرآن صرف ایک جگہ قرآن اکیڈمی لاہور میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے یہ سلسلہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا گیا۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے نہ صرف مملکت خداداد پاکستان کے کئی شہروں میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی بلکہ امریکہ میں بزبانِ انگریزی دورۂ ترجمہ قرآن مکمل کیا۔

۱۹۹۸ء میں آپؒ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وقت کی ضرورت کے مطابق اب اس دورۂ ترجمۂ قرآن کی ڈیجیٹل ریکارڈنگ کروائی جائے تاکہ یہ سیٹلائٹ کے ذریعے آن ایئر نشر ہو سکے اور دنیا میں رہنے والے تمام انسان قرآن حکیم کی تعلیمات اور پیغام سے بہرہ مند ہو سکیں۔ اس پروگرام کے لیے آپؒ کی خواہش تھی کہ یہ قرآن اکیڈمی کراچی خیابانِ راحت میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کی یہ خواہش بھی اپنے فضل سے پوری کرا دی۔ اس کی ریکارڈنگ اعلیٰ ترین پیمانے پر ہوئی اور آج ساری دنیا میں اردو دان طبقہ اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

گزشتہ سال (۲۰۲۵ء) کے رمضان المبارک میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی طرز پر پورے پاکستان میں قریباً ۱۵۰ مقامات پر تنظیم اسلامی کے تحت دورۂ ترجمہ قرآن اور خلاصہ مضامین قرآن کی محافل منعقد ہوئیں۔ خود امیر تنظیم محترم شجاع الدین شیخ نے کراچی میں دورۂ ترجمۂ

قرآن حکیم کی سعادت حاصل کی۔

لاہور میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی سب سے بڑی محفل جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوئی' جہاں آج سے ۴۳ سال قبل حضرت ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس کی ابتدا کی تھی۔ اس سال اس عظیم شخصیت کے فرزند محترم حافظ عاطف وحید نے یہ سعادت حاصل کی۔ الحمد للہ راقم کو اب تک منعقد ہونے والی تمام محافل میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ اس اکیڈمی میں تنظیم اسلامی کے اعلیٰ عہدیداروں نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی اور ہر ایک نے اپنے ظرفِ علمی کے مطابق دورۂ ترجمۂ قرآن کا حق ادا کیا جس سے سامعین نے بھرپور استفادہ کیا۔

الحمد للہ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے تن تنہا ''دورۂ ترجمۂ قرآن'' کے عنوان سے جو کام شروع کیا تھا اب وہ برگ و بار لا رہا ہے۔ تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے علاوہ دوسری تناظیم اور اہلِ علم بھی اسی طرح کی یا اس جیسی محافل منعقد کر رہی ہیں' جس سے ''رجوع الی القرآن'' کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ قلب کی گہرائیوں سے دُعا ہے کہ ربّ کریم ڈاکٹر صاحب کی ان خدمات کو قبول فرمائے۔ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

ڈاکٹر صاحبؒ کے صُلبی اور معنوی فرزندوں کو توفیق مزید عطا فرمائے کہ وہ اس مشن کو چار دانگِ عالَم میں پھیلا دیں ع ''ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!''

ڈاکٹر اسرار احمدؒ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں بہت سے انعام فرمائے ہیں ان میں سے ایک بڑا انعام یہ بھی ہے کہ آپ نے شعوری طور پر اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے مشن کے ساتھ ملائے رکھا اور ان کی تربیت اس طرح فرمائی کہ وہ بھی دعوت رجوع الی القرآن اور اقامتِ دین کے کام میں ان کے معاون و مددگار بن سکیں۔ اس مقصد کے لیے آپ ان کو اپنے دروس اور خطبات میں ساتھ لے جاتے اور ان کی ذہنی تربیت فرماتے تھے۔ اپنی سعی و جُہد کے ساتھ ساتھ اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں بھی محوِ دعا رہتے کہ ربّ کریم ان سب کو اپنے دینِ متین کی خدمت کے لیے قبول فرما۔ احقر نے کئی دفعہ خود ڈاکٹر صاحب کی زبان مبارک سے سنا کہ آپؒ

نے فرمایا: ’’میں نے طواف بیت اللہ کے سات چکروں میں سے ایک چکر اپنی اولاد کی دعاؤں کے لیے مخصوص رکھا ہے‘ جس میں دعا کرتا ہوں کہ ان سب کو خدمتِ دین کے لیے قبول فرما۔‘‘ کئی دفعہ آپؒ نے یہ بھی فرمایا: ’’میری آرزو اور دلی خواہش ہے کہ رب کریم مجھے حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کی سی سعادت نصیب فرمائے کہ ان کی تمام اولاد نے جس طرح دینِ اسلام کی خدمت کی اسی طرح میری اولاد بھی دینِ اسلام کی خدمت میں پیش پیش رہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ انسانوں کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کو قبول فرمانے والا ہے۔ اس نے بھی کمال مہربانی سے ڈاکٹر صاحبؒ کی ان دعاؤں کو قبول فرمایا اور الحمد للہ تمام اولاد کو اقامتِ دین کی جدّ وجُہد اور دعوت رجوع الی القرآن کے کام میں دامے درمے‘ قدمے‘ سخنے ہر اعتبار سے لگا دیا۔ اور اب ان تمام کی زندگیوں کا مرکز ومحور اس مصرعہ کا مصداق ہے کہ ؏ ’’میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی!‘‘ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو اللہ تعالیٰ نے چار فرزند عطا فرمائے جن کا مختصر سا تعارف قارئین کے لیے دلچسپی کے ساتھ ساتھ جذبۂ محرکہ کا کام بھی دے گا اور وہ بھی اپنی اولاد کو دین کے کام میں لگانے کو سعادت مندی اور خوش بختی سمجھیں گے۔

محترم ڈاکٹر عارف رشید ﷾ سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے بھی اپنے والد گرامی کی طرح کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے M.B.B.S کی ڈگری امتیازی حیثیت سے حاصل کی۔ پھر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور سے دو سالہ دعوت رجوع الی القرآن کورس سے سند فراغت حاصل کرنے کے ساتھ مرکزی انجمن کے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ آپ نے انجمن کی مختلف اہم ذمہ داریوں کو باحسن طریقے سے ادا کیا ہے اور آج کل انجمن کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے قریباً دس دفعہ رمضان المبارک کی مقدس راتوں میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی ہے۔ آپ ہر اتوار کی صبح دس بجے قرآن آڈیٹوریم اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن میں اپنے والد مکرم کے طرز پر درس قرآن ارشاد فرما رہے ہیں جس کا دورانیہ ایک گھنٹہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس درس میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے حضرات وخواتین کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ آپ کے جمعہ کے خطبات شہر لاہور میں مختلف مقامات پر ہوتے ہیں جو بہت ہی مقبول ومعروف ہیں۔ آپ کا انداز اور آواز حضرت

ڈاکٹر اسرار صاحبؒ سے اتنی مشابہ ہے کہ دور سے سننے والوں کو مغالطہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ خطاب فرما رہے ہیں۔ دعا ہے کہ ربّ تعالیٰ موصوف کو صحت وعافیت اور سلامتیٔ ایمان کے ساتھ بابرکت طویل عمر عطا فرمائے‘ آپ کی سعی وجُہد کو قبول فرمائے تاکہ آپ ڈاکٹر صاحب کے مشن کو آگے سے آگے لے جائیں۔ آمین!

محترم حافظ عاکف سعید ﷾ دوسرے صاحبزادے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ فلسفہ میں پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دعوت رجوع الی القرآن کے دو سالہ کورس سے امتیازی حیثیت سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد انجمن اور تنظیم کے کئی اہم مناصب پر خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ماہنامہ حکمت قرآن‘ ماہنامہ میثاق اور ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور کی ادارتی ذمہ داریاں بحسن وخوبی ادا کرتے رہے۔ آپ اب بھی قرآن اکیڈمی لاہور کے ڈائریکٹر ہیں۔ سب سے بڑی ذمہ داری آپ نے تنظیم اسلامی کی امارت کی سنبھالی اور اپنی امارت کے دوران تنظیم کے انقلابی پیغام کو آگے بڑھانے کے لیے جسم وجاں کی ساری توانائیاں لگا دیں۔ دن دیکھا نہ رات‘ گرمی دیکھی نہ سردی‘ ایک شعلۂ جوالہ کی طرح ملک عزیز کے شہر شہر‘ قریہ قریہ‘ گاؤں گاؤں کے چکر لگائے اور اپنی اس سعی وجُہد میں کامیابی حاصل کی۔ اس محنت شاقہ کا آپ کی صحت پر گہرا اثر پڑا‘ خصوصاً آپ کی یادداشت میں خلل آنے لگا۔ چنانچہ آپ نے تنظیم کی امارت سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کیا تاکہ کوئی اور اس بارِ گراں کو اٹھا سکے۔ تنظیم کی شوریٰ نے آپ کی اس رائے سے اتفاق کیا اور تنظیم کے تیسرے امیر کے طور پر محترم شجاع الدین شیخ ﷾ کا تقرر ہوا۔ امیر ثانی محترم عاکف سعید نے بھی رمضان المبارک کی مقدس راتوں میں ملک عزیز کے مختلف شہروں اور بیرونِ پاکستان بھی کئی بار دورۂ ترجمۂ قرآن کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آپ کے دورۂ ترجمۂ قرآن اور خطاباتِ جمعہ کافی مقبول ہوئے۔ دعا ہے کہ ربّ کریم آپ کی مساعی کو قبول فرمائے اور صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ آمین!

محترم حافظ عاطف وحید ﷾ ڈاکٹر صاحبؒ کے تیسرے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے اکنامکس میں ایم فل کیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دینی‘ معاشرتی اور سماجی علوم پر یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ناظم اعلیٰ کے ساتھ ساتھ کُلیۃ القرآن کے

مہتمم اور انجمن کے تحت ’’شعبہ تحقیق اسلامی‘‘ کے نگرانِ اعلیٰ کی اہم ذمہ داریاں بھی احسن طریقہ سے انجام دے رہے ہیں۔ الحمدللہ آپ نے رمضان المبارک کی مقدس راتوں میں اب تک قریباً بیس دفعہ دورۂ ترجمہ قرآن کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حافظ عاطف وحید صاحب کو اپنے والد گرامی کی طرح کئی اوصاف سے متصف کیا ہے۔ زبان و بیان پر آپ کی مہارت اور گرفت نیز تحقیق وتدقیق پر مشتمل دورۂ ترجمہ قرآن سامعین وناظرین کو سحر انگیزی میں لیے رکھتا ہے۔ موصوف نے قرآن حکیم کے دقیق اور اہم مضامین کو جس طرح عام فہم اور آسان الفاظ کے پیرائے میں بیان کیا وہ انتہائی لائقِ ستائش ہے۔ مزید اللہ کا کرم یہ ہے کہ چہرے بشرے سے اپنے والد گرامی سے بہت مشابہت ہے۔ دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت اسی شمع کے پروانوں پر مشتمل تھی‘ اس لیے عقیدت ومحبت کا روح پرور سماں بندھ جاتا تھا۔ دلی دعا ہے کہ ربّ کریم موصوف کو صحت وعافیت اور سلامتیٔ ایمان کے ساتھ برکت والی طویل عمر عطا فرمائے اور آپ کی جملہ مساعی کو قبول فرمائے۔

آپ کے دورۂ ترجمہ قرآن کے روح پرور موقع پر جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں قریباً ہر رات چھ سات سو حضرات وخواتین شامل ہوتے رہے ہیں‘ جن میں زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے حضرات موجود تھے۔ ان کا انہماک اور جوش وخروش دیدنی تھا اور اکثر سے یہ کہتے سنا گیا کہ ’’قرآن کا پیغام تو آج سمجھ میں آیا ہے۔‘‘

محترم آصف حمید حفظہ اللہ ڈاکٹر صاحبؒ کے چوتھے اور چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح اپنے والد گرامی کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ کی مساعی کا اصل میدان جس میں آپ نے اپنی مہارت وصلاحیت کے جھنڈے گاڑے ہیں وہ ’’سوشل میڈیا‘‘ کا پلیٹ فارم ہے۔ آپ کی شبانہ روز کی مساعی‘ حاضر دماغی اور مستقبل کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر منصوبہ بندی کی خداداد صلاحیت نے اللہ کے فضل وکرم سے ڈاکٹر صاحبؒ کی دعوت اور مشن کو چاردانگِ عالم میں پھیلا کر ’’امر‘‘ کر دیا ہے۔ آپ انجمن خدام القرآن لاہور کے اہم شعبہ ’’سمع وبصر‘‘ کے انچارج ہیں‘ جو کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے ویڈیوز‘ آڈیوز وغیرہ تیار کرتا ہے اور یہی شعبہ اس کو اطرافِ عالم میں پھیلاتا ہے۔ آپ کی زیر نگرانی تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن

کے تحت چلنے والی ویب سائٹس کے علاوہ بیسیوں ویب سائٹس ہیں جن پر وزٹ کرنے والوں کی ماہانہ تعداد کروڑوں میں ہے۔ تنظیم اسلامی کے تحت منعقد ہونے والے پروگرام ’’زمانہ گواہ ہے‘‘ کی ریکارڈنگ آپ ہی کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ دعوت رجوع الی القرآن کورس میں آپ ’’عربی گرامر‘‘ جیسے مشکل اور خشک مضمون کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس قدر عام فہم اور آسان بنا دیتے ہیں کہ طلبہ الجھن کا شکار نہیں ہوتے۔ دلی دعا ہے کہ رب کریم موصوف کی خدمات کو قبول فرمائے اور مزید آگے سے آگے بڑھنے کی توفیق فرمائے۔ آمین!

الحمدللہ اس سال رمضان المبارک ۱۴۴۷ ہجری مطابق فروری ۲۰۲۶ء تنظیم اسلامی پورے پاکستان میں دورۂ ترجمہ قرآن اور مختصر ترجمۂ قرآن منعقد کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ پچھلے سال تقریباً پورے پاکستان میں ۱۵۰ سے زائد مقامات پر اسی طرح کی محافل منعقد کی گئی تھیں اور اس سال ان شاء اللہ پچھلے سال کی نسبت زیادہ مقامات پر یہ محافل منعقد کی جائیں گی۔ اس سال پاکستان میں تنظیم اسلامی کے تحت دورۂ ترجمہ قرآن کی سب سے بڑی محفل شہر لاہور میں منعقد ہوگی جس میں ترجمہ قرآن کریم مع مختصر تشریح وتوضیح کی سعادت امیر تنظیم اسلامی محترم شیخ شجاع الدین حفظہ اللہ حاصل کریں گے۔ امیر تنظیم جناب شیخ شجاع الدین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بات کو انتہائی سادہ‘ عام فہم اور تیزی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ قلب کی گہرائیوں سے نکلنے والے جذبات ہوتے ہیں جو کہ سامعین کے کانوں سے ہوتے ہوئے قلب و دماغ کے نہاں خانوں میں اتر جاتے ہیں اور قلب ودماغ گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ سن رہے ہیں وہ صد فیصد صحیح اور درست ہے۔ اسی بات کو فارسی کا ایک جملہ بڑے اچھے پیرائے میں بیان کرتا ہے ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ یعنی جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل پہ اثر کرتی ہے۔ بقول اقبال ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اس سال امیر محترم شجاع الدین شیخ ڈی فلورلیس مارکی‘ بلاک D2 جوہر ٹاؤن لاہور میں دورۂ ترجمہ قرآن کی محفل سجا رہے ہیں۔ (باقی صفحہ 155 پر)

ایک معمولی سی کوشش —— اجر بہت بڑا!

ادارہ ’’میثاق‘‘ کے ساتھ عملی تعاون کی ایک صورت!

اگر آپ ’’میثاق‘‘ کے مستقل خریدار ہیں اور اسے اپنے لیے مفید خیال کرتے ہیں تو فطری طور پر آپ کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ اسے اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرائیں۔ نبی اکرمﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں کہ ’’تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے‘‘ یہ ہمارا دینی واخلاقی فریضہ بنتا ہے کہ ماہنامہ ’’میثاق‘‘ کے ذریعے جو علمی وفکری رہنمائی ہمیں حاصل ہو رہی ہے‘ اُسے عام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کا حلقۂ احباب یقیناً بہت وسیع ہوگا‘ لیکن آغازِ کار کے طور پر آپ ان میں سے صرف دو حضرات کو ’’میثاق‘‘ کا سالانہ خریدار بنائیے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی ذرا سی کاوش سے کسی شخص کی زندگی کا رُخ بدل جائے‘ اُس کے باطن میں ایمان کی حرارت پیدا ہو جائے‘ اس کا تصوّرِ دین درست ہو جائے اور وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے۔ یوں اُس کے نیک اعمال کا ثواب آپ کو بھی برابر ملتا رہے‘ اس لیے کہ حضور نبی اکرمﷺ نے فرمایا ہے کہ ’’خیر کی جانب رہنمائی کرنے والا‘ خیر کا کام کرنے والے کی مانند ہے!‘‘

قیمت فی شمارہ : 60روپے   سالانہ زرِتعاون : 600روپے

برائے رابطہ: منیجر مکتبہ خُدام القرآن‘ 36-K‘ ماڈل ٹاؤن‘ لاہور

فون: 3-(042)35869501‘ 0341-4941212

ای میل: maktaba@tanzeem.org

Feb. 2026
Vol.75

Regd. CPL No.115
No.2

Monthly **Meesaq** Lahore

PHARMA

Your **Health**
Our **Devotion**

NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com